فلسفۂ
ولایت

٢٩٧
/١٤٥
م٤٢٩٦

۲۹۷
/۴۵
م۶۲۹ف

فلسفہ ولایت

اُستاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

یکے از مطبوعاتؒ

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲

تالیف ـــــــــ استاد شہید مرتضیٰ مطہری

تدوین ـــــــــ رضا حسین رضوانی

اصلاح و نظر ـــــــــ کاظم علی گجراتی

طبع سوم ـــــــــ ۱۹۹۱ء

مطبع ـــــــــ شاہین پیکجز

جملہ حقوق محفوظ : یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعۂ ہٰذا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریۃً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

(ناشر)

قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارۂ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا، تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو"
(سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکریٹری نشر و اشاعت

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پُورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دُعا ہے کہ خداوند منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:
(شیخ) یوسف علی نفسی نجفی
وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

عناوین

پیش لفظ ۷
لفظِ ولی ۱۱
وِلا کی دو قسمیں ۱۲
منفی وِلا ۱۴
عام مُثبت وِلا ۲۲
خاص مُثبت وِلا ۲۹
خاص مُثبت وِلا کی اقسام ۳۵
وِلائے قرابت ۳۶
وِلائے امامت ۴۸
وِلائے زِعامت ۵۴
وِلائے تصرّف ۶۲
ضمیمے ۱۰۵
وِلائے تصرّف کی مزید وضاحت ۱۰۷
امام کی معنوی اور باطنی ہدایت ۱۶۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب جو دراصل فارسی میں لکھی گئی، مُتبحّرِ عالم آیتُ اللہ مرتضیٰ مطہّری شہیدؒ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں ایک دلچسپ موضوع پر بحث کی گئی ہے جس پر جہاں تک ہمیں علم ہے اس سے پیشتر قلم نہیں اٹھایا گیا۔

وَلِی، وَلَا، وِلَا، مَوْلَا وغیرہ کے الفاظ کا مأخذ مشترک ہے اور اس کے مشتقات قرآن مجید اور حدیث میں ان کے لغوی، اصطلاحی اور دینی معنوں میں بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔ فقط قرآن مجید میں ہی یہ مختلف سیاق وسباق میں کئی سو مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ فاضل مصنف نے ان کے لسانیاتی معنوں اور دینی کتابوں میں ان کے مختلف مفاہیم سے بحث کی ہے۔

بعض حلقوں میں ان الفاظ میں سے چند ایک کی تعبیر اور مفہوم

کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ تاہم مصنّف نے اس بارے میں ہر قسم کے شک وشبہ اور الجھن کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لفظ وَلِیّ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ، رسولِ اکرمؐ، امام علیؑ اور عامۃ المسلمین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مصنّف نے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ ہر موقع پر اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ وِلاء کی کئی قسمیں ہیں اور ان کے مختلف درجے ہیں۔ فاضل مصنّف نے ان کا جو تجزیہ کیا ہے وہ دلچسپ اور فکرانگیز ہونے کے ساتھ ساتھ طبع زاد بھی ہے۔ بہرحال انھوں نے اپنے خیالات کی تائید میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث بھی نقل کی ہیں، کتاب کا یہ حصّہ دقیق مطالعے کے قابل ہے۔

بحث کے دوران استاذ محترم نے کئی ایک دوسرے اہم نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اِمامت اور خِلافت کے مابین فرق واضح کیا ہے اور لفظ "امام" کے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ یہ لفظ امّتِ مسلمہ کے ایک دینی اور دُنیاوی معصوم پیشوا کے لیے استعمال ہونے کے علاوہ امامِ جماعت، عالمِ دین، ممتاز سماجی اور سیاسی رہنما اور حاکم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے، کئی ایک ایسے امام بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور انھیں جہنم میں لے جاتے ہیں۔ احادیث میں بھی غیر عادل اماموں کا ذکر ہے۔

مصنف نے ایک معصوم امام کے اوصاف اور فرائضِ منصبی پر بحث کی ہے اور بالتفصیل بتایا ہے کہ وہ کس نوعیت کی اطاعت محبّت اور احترام کا مستحق ہے۔ انھوں نے امام کی اس پوشیدہ قوّت کا ذکر بھی کیا ہے جس کی بدولت وہ دنیا کے کاروبار کی نگرانی کرتا ہے اور تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے جو اس بارے میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

آیت اللہ مطہری نے جن دوسرے نکات پر روشنی ڈالی ہے ان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات، روحانی زندگی اور اس کے درجات اور معجزوں کی ماہیت وغیرہ شامل ہیں۔

انھوں نے ہر نکتے کا تجزیہ اس علمی تبحر کے ساتھ کیا ہے، جس کے لیے وہ معروف ہیں اور ان کا نام اس کتاب کے گراں بہا اور عالمانہ ہونے کا ٹھوس ثبوت ہے۔

مذکورہ بالا کتاب کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ تعلیمات اسلامی کی یہ سعی قارئین کے لیے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

شیخ یوسف علی نفسی نجفی

لفظ ولی

وَلا، وَلایت، وِلایت، وَلی، مولیٰ، اولیٰ اور ان سے مشابہ کئی دوسرے الفاظ مادہ ولی سے مشتق ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اور اس کے مشتقات مختلف شکلوں میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن میں یہ الفاظ ۱۲۴ مرتبہ بطور اسم اور ۱۱۲ دفعہ بطور فعل استعمال ہوئے ہیں۔

جیسا کہ راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں کہا ہے، اس لفظ کے اصلی معنیٰ ایک چیز کے دوسری چیز کے پہلو میں یوں موجود ہونے کے ہیں کہ ان میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہے۔ اسی مناسبت سے یہ کلمہ قرب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام مشتقات دوستی، محبت، حمایت، سرپرستی اور تسلّط وغیرہ کے معنیٰ میں استعمال

ہوتے ہیں کیونکہ ان تمام الفاظ میں کسی نہ کسی قسم کے قرب اور اتّصال کا تصوّر پایا جاتا ہے۔

مادہ وَلِی اور اس کے مشتقات کے بہت سے معنیٰ بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً لفظ مَولَا کے ۲۷ معانی بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ امر واضح ہے کہ ابتدا میں یہ لفظ ان تمام معانی کے لیے وضع نہیں کیا گیا اور یہ فقط ایک اصلی معنیٰ کا حامل ہے۔ جہاں تک دوسرے معانی کا تعلق ہے تو وہ کلام کے سیاق وسباق سے ہی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

وِلَایَت اور وَلَایَت کے الفاظ کے استعمال کے بارے میں راغب کا کہنا ہے کہ وِلَایَت کے معنیٰ مدد اور وَلَایَت کے معنیٰ کسی کام کی ذمّہ داری سنبھالنے کے ہیں۔ تاہم درحقیقت دونوں لفظوں کے معنیٰ ذمّہ داری سنبھالنے کے ہیں۔

وَلِی اور مَولَا کے الفاظ کے بارے میں راغب کا کہنا ہے کہ دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ کبھی فاعلی صورت میں اور کبھی مفعولی صورت میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر وہ ان کے مواردِ استعمال کا ذکر کرتا ہے۔

وِلا کی دو قسمیں

قرآن مجید میں وِلا، مُوالات اور تولّا (دوستی اور تعاون) کا ذکر اکثر آیا ہے اور اس کتابِ مقدّس نے ان عنوانات کے تحت مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔

قرآن مجید کے دقیق مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق ولا کی دو قسمیں ہیں : منفی اور مثبت۔ مسلمانوں کو مثبت ولا اختیار کرنے اور منفی ولا سے اجتناب برتنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس مثبت ولا کا حکم اسلام نے دیا ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں : عام اور خاص۔ خاص ولا کو مزید کئی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ولائے محبّت، ولائے امامت ولائے زعامت اور ولائے تکوینی۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مختصر بحث کریں گے۔

منفی ولا

قرآن مجید نے مسلمانوں کو غیر مسلموں سے دوستی اختیار کرنے اور انھیں بطور سرپرست قبول کرنے سے بڑی سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام مسلمانوں کے اپنے ہم جنسوں سے اچھے تعلقات استوار کرنے کے خلاف ہے یا وہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہیں اور ان سے کوئی بھلائی نہ کریں۔ قرآن مجید واضح الفاظ میں فرماتا ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ. اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ.

جو لوگ تم سے تمھارے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور نہ انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اللہ تمھیں ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف سے پیش آنے سے منع نہیں کرتا

بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۂ ممتحنہ - آیت ۸)

اسلام یہ نہیں کہتا کہ اچھے تعلقات صرف مسلمانوں تک محدود رہنے چاہئیں یا یہ کہ مسلمانوں کو دوسروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک ایسا مذہب جس کے پیغمبرؐ کو قرآن مجید میں رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِیۡن کے لقب سے یاد کیا گیا ہو اس قسم کے احکام کیسے دے سکتا ہے؟

دراصل مسلمانوں کو غیر مسلموں کی دوستی سے اجتناب برتنے کا حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے دوستی کے دعووں کے باوجود مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کی معاندانہ چالوں اور سرگرمیوں سے غافل نہ رہیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ دشمن کو دوست سمجھیں اور اس پر اعتماد کریں۔

ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو امّتِ مسلمہ کا فرد اور اس کل کا جزو سمجھے۔ ایک مِلّت کے فرد کی حیثیت سے انسان پر خود بخود کچھ شرائط اور کچھ پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ چونکہ غیر مسلم ایک الگ مِلّت کے افراد ہوتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کے ان کے ساتھ تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جو ان کی اسلامی معاشرے کی رکنیت کے ساتھ ناسازگار نہ ہوں۔ انھیں اپنی آزادی اور سالمیت کو کسی قیمت پر بھی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ لہذا ایک مسلمان کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اس طرح کے نہیں ہو سکتے، جیسے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ

ہوتے ہیں۔

ضروری ہے کہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات اتنے قریبی اور مخلصانہ ہوں جتنے کہ ایک ملت کے افراد کے مابین بالعموم ہونے چاہئیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق اس دوستی کا منفی پہلو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ غیر مسلموں سے میل جول کے معاملے میں مسلمان اس بات کا خیال رکھے کہ اس کا واسطہ ایک غیر ملت کے فرد سے ہے اور اس کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت ایک مسلمان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت سے مختلف ہونی چاہیے' مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان غیر مسلموں سے ایسے تعلقات نہ رکھے کہ عملی طور پر وہ غیر مسلم معاشرے کا ایک فرد بن جائے۔ گویا اسے کسی وقت بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ امتِ مسلمہ کا فرد ہے۔

ایک مسلمان کے لیے ایک غیر مسلم کے ساتھ شائستہ اور دوستانہ برتاؤ کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم اسے غیر مسلم کی وِلا قبول نہیں کرنی چاہیے یعنی اسے مُسلم جماعت کے فرد کی حیثیت نہیں دینی چاہیے جس سے خود اس کا اپنا تعلق ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کے یہ دونوں انداز ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں۔

اِسی طرح منفی وِلا اور انسان دوستی کے اصولوں میں بھی کوئی منافات نہیں ہے۔ انسان دوستی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان کو سبھی ابنائے آدم کے مستقبل اور ان کی بہتری اور

خوشحالی کا خیال ہو۔ جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے وہ فطری طور پر تمام بنی نوع انسان کی فلاح کا طالب ہوتا ہے اور اسی بنا پر چاہتا ہے کہ سبھی لوگ دینِ اسلام قبول کر کے نجات حاصل کریں، تاہم جب تک وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہو جاتے، مسلمانوں کے مفادات کو ان کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل کو مٹایا جا سکتا ہے۔

فرض کیجیے کہ کچھ اشخاص کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ ہم ان کی صحت یابی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں اور انھیں ہر قسم کی طبی سہولتیں مہیا کریں اور ان کی علالت کے دوران میں ان سے ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کریں۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو لوگ کسی وبائی مرض میں مبتلا ہوں انھیں دوسروں سے الگ نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ گو اسلام مسلمانوں کو غیر مسلموں سے ہمدردانہ سلوک کی اجازت دیتا ہے لیکن اس بات پر رضامند نہیں کہ وہ ان کی ذہنی اطاعت قبول کر لیں۔

اسلام بنی نوع انسان سے محبت کا مذہب ہے، وہ ایک مشرک سے بھی پیار کرتا ہے لیکن اس کے شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا رنج بھی ہوتا ہے کہ اس کا ایک ہم جنس راہِ راست سے بھٹک گیا ہے۔ اگر اسے اس کے ساتھ محبّت نہ ہوتی تو وہ اس کی حالت پر ملول بھی نہ ہوتا اور نہ ہی اُسے اس بات کی پروا

ہوتی کہ آئندہ اس کا کیا بنے گا۔

اسلام میں محبّت اور نفرت دونوں موجود ہیں لیکن یہ دونوں محض جذباتی اور اتفاقی نہیں بلکہ معقول اور منطقی ہیں۔ جو دوستی یا دشمنی محض جذبات کی بنا پر وجود میں آئے اس کی کوئی عقلی اساس نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا اندھا اور بہرا احساس ہے جو ذہنِ انسانی پر چھا جاتا ہے اور جدھر چاہے اس کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ دوستی اور دشمنی جو شعوری اور عقلی طور پر پیدا ہو، اس کی اصل وجہ اپنے ایک ہم جنس کی قسمت کے بارے میں انسان کی فکر ہوتی ہے۔

ایک مثال۔ والدین کو اپنے بچّے سے دو قسم کی محبّت ہوتی ہے، ایک منطقی اور دوسری جذباتی۔ منطقی محبّت بعض اوقات انھیں ایسے اقدام پر مجبور کرتی ہے جس کے نتیجے میں بچے کو تکلیف اور پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وجہ سے بچّے کا آپریشن ضروری ہوجائے تو وہ اسے سرجن کے حوالے کر دیتے ہیں۔ گو ممکن ہے کہ وہ اس موقع پر روئیں لیکن اس کے باوجود وہ سرجن کو جلد از جلد آپریشن کرنے کو کہتے ہیں اور اس امر کی اجازت بھی دیتے ہیں کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو متاثرہ عضو کو کاٹ دے۔ وہ آنسو تو جذباتی محبت کی وجہ سے بہاتے ہیں لیکن آپریشن کرنے اور عضو کاٹنے کی اجازت منطقی محبت کی بنا پر دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی جذباتی محبت کو فوقیت دیں اور اس عضو

کے کاٹنے کی اجازت نہ دیں تو فی الحقیقت وہ بچّے کو موت کے مُنہ میں دھکیل دیں گے لیکن اپنی عقلی محبت اور بچے کی بہبود میں دلچسپی کی بنا پر وہ اپنی جذباتی محبت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بچّے کے تکلیف اور پریشانی اٹھانے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی صحّت کی بحالی کے لیے ایک باشعور شخص سرجن کے پاس جاتا ہے اور مثال کے طور پر اسے کہتا ہے کہ میری انگلی کاٹ دیجیے۔ درحقیقت وہ خوشی سے انگلی نہیں کٹوانا چاہتا اور نہ ہی اس درد اور تکلیف سے دوچار ہونا چاہتا ہے جو آپریشن کے نتیجے میں اسے ہوگی۔ اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ایک انگلی کٹ جانے سے اسے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم اس کا شعور اور منطق اسے اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ درد سہہ لے اور عضوی نقص کو برداشت کر لے، ایسے حالات میں جذبات نہیں بلکہ شعور اور منطق ہی انسان کو آپریشن کرانے پر آمادہ کرتے ہیں۔

کفر اور جہالت میں مبتلا معاشرے سے فساد کا قلع قمع کرنے کے لیے اسلام ایک طرف تو جنگ لڑنے کا حکم دیتا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ.

"ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی
نہ رہے۔
(سورۂ بقرہ - آیت ۱۹۳)

اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے کہ کافروں سے اپنے دل کی بات نہ کہیں تاکہ معاشرہ محفوظ رہے۔ اس طریقِ عمل اور بنی نوعِ انسان سے ہمدردی کے اصول کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔

تقلید انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ انسان اکثر لاشعوری طور پر دوسروں کے خیالات اور نظریات اپنا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ.

اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم انھیں محبّت کی پیشکش کروگے جب کہ وہ دینِ حق سے انکار کرتے ہیں؟
(سورۂ ممتحنہ - آیت ۱)

اور پھر فرماتا ہے:

إِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ.

اگر یہ لوگ تم پر قابو پالیں تو تمھارے دشمن

ہو جائیں گے اور تمھیں ایذا پہنچانے کے لیے اپنے
ہاتھ اور زبانیں تمھاری جانب بڑھائیں گے اور
وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ۔

(سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۲)

یہاں قرآن مجید اس امر کی وجہ بیان کرتا ہے کہ مسلمان کیوں کفار سے محتاط رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کفار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے طور طریقے اور نظریات دوسرے لوگ بھی اپنا لیں۔ پس ظاہر ہے کہ ان سے دوستی اور میل جول رکھنا کتنے بڑے خطرے کا موجب ہے۔

ان حالات میں ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے بارے میں ہوشمندی اور سوجھ بوجھ سے کام لیں۔ انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق ایک ایسے معاشرے سے ہے جس کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور جو غیر مسلم معاشرے سے قطعاً مختلف ہے۔ تاہم اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ مسلمان سرے سے غیر مسلموں کے ساتھ کوئی معاشرتی اقتصادی اور سیاسی رابطہ ہی نہ رکھیں۔ جو بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام روابط اسلامی معاشرے کے مختلف مفادات کے ماتحت ہوں۔

عامِ مُنثبت وِلا

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان ہر لحاظ سے منظم اور سماجی نقطۂ نگاہ سے مربوط اکائی کے طور پر آزادانہ زندگی بسر کریں۔ ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایک جسم یعنی اسلامی معاشرے کا عضو تصوّر کرے تاکہ وہ معاشرہ قوت حاصل کرے، کیونکہ قرآن مجید اسلامی امّہ کو دوسری قوموں سے برتر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ.

"بد دل نہ ہو اور کُڑھو نہیں، اگر تم سچّے مومن ہو تو تم ہی غالب رہوگے۔"

(سورۂ آل عمران - آیت ۱۳۹)

گویا ایمان کو برتری کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جو اسلامی معاشرے کی وحدت کی بنیاد، اس کی شخصیت کا سہارا،

اس کی آزادی کی ضمانت اور اسے متحرک رکھنے والی قوّت ہے۔
قرآن مجید فرماتا ہے:
وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ.
"آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمّت ہار دو گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی بلکہ ثابت قدم رہو"
(سورۃ انفال ۔ آیت ۴۶)

مسلمانوں میں باہمی نزاع اور نااتفاقی اسلامی معاشرے کی چولیں ہلا کر رکھ دیتی ہے اور اس کے رعب داب کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جو ان کے مابین دوستی، محبّت اور خلوص کی بنیاد ہے۔
قرآن مجید فرماتا ہے:
وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ. يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.
"تمام اہل ایمان مرد اور عورتیں ایک دُوسرے کے ولی ہیں ۔ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں"
(سورۃ توبہ ۔ آیت ۷۱)

مومنوں کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے اور اسی بنا پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے حالات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں اور دراصل ایسا کرتے ہوئے وہ خود اپنے

حالات میں دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ وہ سب مل کر ایک مربوط اکائی تشکیل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھے کاموں کی تلقین کرتے ہیں اور برُے کاموں سے روکتے ہیں۔ یہ تلقین اور یہ مناہی کا جذبہ محبت ایمانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں جملہ یَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برُے کاموں سے روکتے ہیں) اس قول کے فوراً بعد آیا ہے جس میں مسلمانوں کی ولائے ایمانی کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے لوگوں کی سرنوشت میں دلچسپی کا مآخذ دراصل خود ان لوگوں کی ذات میں دلچسپی ہوتا ہے۔ جب باپ کو اپنے بچوّں میں دلچسپی ہو اس کے دماغ میں خود بخود ان کے مستقبل کے بارے میں فکر پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ اسے دوسروں کے بچوں میں کوئی دلچسپی نہ ہو کہ ان سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ پھر اسی عدم دلچسپی کی بنا پر وہ ان کے بارے میں فکرمند بھی نہیں ہوتا، نیز ان کے اچھّے یا برُے اخلاق کی وجہ سے اس کے دماغ میں مثبت یا منفی احساسات پیدا ہونے کا بھی امکان نہیں ہوتا۔

اچھّے کاموں کی تلقین کرنا اور برُے کاموں سے روکنا انھی مثبت اور منفی احساسات کی پیداوار ہیں اور یہ احساسات اُنس اور محبّت کے بغیر وجود میں نہیں آتے۔

اگر ایک شخص کو کسی دوسرے شخص میں کوئی دلچسپی نہ ہو تو

وہ اس کے اخلاق اور اطوار سے بے اعتنائی برتے گا لیکن اگر وہ اس میں دلچسپی رکھتا ہو تو یہ دلچسپی اسے لاپروا نہیں رہنے دے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نیکیوں کی تلقین اور بدیوں سے مناہی کو ولا کے عنوان سے مربوط کر دیا ہے ۔

پھر امر اور نہی کے نتیجے کے طور پر قرآن مجید نے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے ۔ وہ فرماتا ہے :

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ .

وہ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور زکات دیتے ہیں ۔

نماز خالق اور بندے کے درمیان تعلق کی آئینہ دار ہے اور زکوٰۃ سے مسلمانوں کی اس باہمی محبت اور خیر خواہی کا اظہار ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔

اور اس کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے :

أُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ * وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ .

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا اور وہ خوشحال ہوں گے ۔

آئندہ صفحات میں ہم اس آیت کے بارے میں مزید وضاحت کریں گے اور بتائیں گے کہ اس آیت اور کئی دوسری آیات میں قرآن نے جس عام مثبت ولا کا ذکر کیا ہے اس کا مقصد فقط محبت اور دلی لگاؤ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر باہمی خیر خواہی اور

ہمدردی کے سلسلے میں ایک نوع کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔

ایک مشہور حدیث کے مطابق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى بَعْضُہٗ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ اَعْضَاءِ جَسَدِهٖ بِالْحُمّٰى وَالسَّهَرِ.

باہمی محبّت اور ہمدردی کے لحاظ سے مسلمان ایک زندہ جسم کی مانند ہیں۔ اگر جسم کے ایک عضو میں تکلیف ہو تو دوسرے اعضا بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

حضرت ختمی مرتبتؐ اور ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے آپ سے تربیت حاصل کی، قرآن مجید فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ.

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے ساتھ بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں
(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

یہ آیت عام مثبت اور منفی دونوں قسم کی وِلا کی جانب

اشارہ کرتی ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے دشمن ہمیشہ منفی وِلا کو مثبت ولا میں اور مثبت وِلا کو منفی وِلا میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ اس کوشش میں رہے ہیں کہ مسلمانوں کے دوسروں سے پرتپاک تعلقات استوار ہوں لیکن خود مسلمانوں میں کسی نہ کسی بہانے پھوٹ پڑی رہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تفرقات کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود ہمارے دور میں غیر مسلموں نے اس بارے میں بے حد سرگرمی دکھائی ہے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر بھاری رقوم صرف کی ہیں۔ افسوس ہے کہ اپنی ان کوششوں کے نتیجے میں وہ مسلمانوں میں ایسے عناصر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کا واحد مقصد مثبت وِلا کو منفی وِلا میں اور منفی وِلا کو مثبت وِلا میں تبدیل کرنا ہے۔ ان نابکاروں کی جانب سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ سب سے بڑی ضرب ہے اور یہ ایک بڑا المیہ ہے جس سے عالمِ اسلام ان دنوں دوچار ہے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

فَيَا عَجَبًا! وَاللّٰهِ يُمِيتُ الْقَلْبَ وَ يَجْلِبُ الْهَمَّ مِنِ اجْتِمَاعِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ عَلٰى بَاطِلِهِمْ وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ.

واللہ! یہ کتنے دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ

دشمن باطل پر ہونے کے باوجود متحد ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے منتشر ہو۔

اے پروردگار! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی طاہر آل ؑ کے صدقے میں اسلام اور مسلمانوں کو ان نابکاروں کے شر سے محفوظ رکھ۔

خاص مُثبت وِلا

اہلِ بیتِ رسولؐ سے محبت رکھنا مثبت وِلا کی خاص صورت ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ آپ کے اہلِ بیتؑ سے محبّت رکھیں۔ حتیٰ کہ علمائے اہلِ تسنن بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے۔ یہی وہ وِلائے خاص ہے جس کا ذکر اہلِ بیت علیہم السلام کے بارے میں نازل شدہ آیتِ مودّت

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا۔

(سورہ شوریٰ۔ آیت ۲۳)

میں کیا گیا ہے۔

حدیثِ غدیر جو ایک معروف اور مسلّم حدیث ہے، اس کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا:

"مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ."

جو شخص مجھے اپنا مولا سمجھتا ہے اسے چاہیے کہ علیؑ کو بھی اپنا مولا سمجھے۔"

اس حدیث میں بھی ایک قسم کی ولا مضمر ہے جس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

شیعہ اور سنی دونوں مکاتب کے علماء اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت امام علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے:

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ.

تمہارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

(سورۂ مائدہ - آیت ۵۵)

طبری نے اس بارے میں بہت سی روایات نقل کی ہیں [۱]

زمخشری جو ایک ممتاز سُنّی عالِم ہے، بڑے وثوق سے کہتا ہے:

"یہ آیت امام علی علیہ السلام کے بارے میں

---

[۱] تفسیر طبری جلد ۶ صفحہ ۲۸۸-۲۸۹۔

نازل ہوئی ہے۔ گو یہ فقط ایک شخص سے منسوب ہے، لیکن صیغہ جمع کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی امام علیؑ کی قائم کردہ مثال کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب دلائی جائے اور یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرنے کے لیے نماز کو بھی تعویق میں ڈالا جا سکتا ہے۔"[1]

دوسرے الفاظ میں اگر ایسی صورت پیش آئے کہ نماز کی ادائیگی کے دوران زکات دینی پڑے تو محض نماز کی وجہ سے زکات کی ادائیگی کو التوا میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

فخرالدین رازی اہل سنت والجماعت کے ایک اور معروف عالم ہیں، وہ کہتے ہیں:

"یہ آیت امام علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور علماء کا اتفاق ہے کہ علیؑ کے سوا کسی نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے۔"[2]

پس زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ "ولی" کے معنوں میں اختلافِ رائے ہو لہذا ہم اس آیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے اس نکتے پر بحث کریں گے۔

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۱ صفحہ ۵۰۵ مطبوعہ مصر ۱۳۷۳ھ۔

[2] تفسیر کبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۰ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ۔

علی بن حمّاد عدوی بصری بغدادی جو چوتھی صدی ہجری کا ممتاز شیعہ شاعر گزرا ہے، اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

قرن الالٰہ ولائہ بولائہ
ممّا تزکّٰی وھو حان یرکع
سمّاہ ربّ العرش نفس محمّدٍ
یوم المباھل وذاک ما لا یدفع

"چونکہ امام علیؑ نے نماز پڑھتے ہوئے زکات ادا کی اس لیے اللہ نے امام کی ولا کو اپنی ولا کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ مباہلہ کے وقت اللہ نے امام علیؑ کو محمدؐ کا نفس کہا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلانا ممکن نہیں۔" [1]

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اسلام نے تمام مسلمانوں کے ساتھ ایک عام قسم کی مثبت ولا کی سفارش کی ہے اور آیت شریفہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (تمام مومنین خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لیکن جس آیت میں کہا گیا ہے کہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ الخ (تمہارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت

---

[1] ریحانۃ الادب جلد ۵ صفحہ ۳۱۱۔

میں زکوٰۃ دیتے ہیں) وہ عام مفہوم کی حامل نہیں ہے ۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس آیت کا اشارہ عام ولایت کی جانب ہے کیونکہ یہاں قرآن مجید کا مقصد ایک عام قاعدہ مرتب کرنا نہیں ہے۔

یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ اصولی طور پر نماز کی حالت میں زکوٰۃ دینا واجب ہے یا کم از کم ایک پسندیدہ فعل ہے بلکہ ایک مخصوص فعل کا ذکر کرنا مقصود ہے جو ایک مخصوص شخص نے انجام دیا اور اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ وہ شخص خاص ولایت کا مستحق ہے ۔

ایک فرد واحد سے مربوط واقعہ کے لیے جمع کا صیغہ قرآن مجید میں اور مقامات پر بھی استعمال کیا گیا ہے ۔

مثلاً ارشاد ہوا ہے کہ

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو طاقت ور لوگ ضرور کمزوروں کو نکال باھر کریں گے ۔ (سورۃ منافقون ۔ آیت ۸)

اس آیت میں گو يَقُوْلُوْنَ (وہ کہتے ہیں) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں لیکن اس واقعہ کا تعلق فقط ایک شخص یعنی عبداللہ بن اُبَیّ سے تھا اور اسی نے یہ الفاظ کہے تھے ۔

اسی طرح موجودہ دور کی بامحاورہ زبان میں بھی بعض اوقات ہم کہتے ہیں کہ " وہ یوں کہتے ہیں " حالانکہ ہم اس بات سے

بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ جو قول نقل کیا جا رہا ہے، وہ فقط ایک شخص کا ہے۔

نماز پڑھتے ہوئے زکات ادا کرنا کوئی عام فعل نہیں، لہذا یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ یہ فعل بجا لائیں، اللہ ان سب کی تعریف کرتا ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے اطلاق کی نوعیت مخصوص اور ذاتی ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک ایسا شخص ہے، جو اللہ کی عبادت کرتے ہوئے بھی اپنے ہم جنسوں کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرح وہ شخص بھی مومنین کا ولی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس "ولا" سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ فقط ایک خاص محبت اور ارادت ہے جو لوگوں کو امام علیؑ سے رکھنی چاہیے یا اس سے بالاتر چیز ہے؟ اس موضوع پر ہم اگلے صفحات میں بحث کریں گے۔ فی الحال ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہل سنت کے بعض علماء کے برعکس یہ آیت عام "ولا" پر نہیں بلکہ خاص "ولا" پر دلالت کرتی ہے۔

خاص مثبت ولا کی اقسام

یہ تو ہم ملاحظہ کر چکے ہیں کہ امام علی علیہ السلام اور اہل بیتؑ کے دوسرے افراد سے محبت کا لزوم ایک مسلمہ امر ہے۔ اب فقط ایک نکتہ قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اس محبت کی صحیح نوعیت کیا ہے؟

اس نکتے کی وضاحت کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ "ولا" اور "ولایت" کے الفاظ (جن کا ترجمہ ہم نے "محبّت" کیا ہے) اہلِ بیتؑ کے متعلق قرآن اور سنت میں کس سیاق و سباق میں استعمال ہوتے ہیں۔

بالعموم یہ الفاظ چار مختلف معانی میں آتے ہیں۔

ولائے قرابت ، ولائے امامت
ولائے زعامت ، ولائے تصرف

وِلائے قرابت

مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اہلِ بیتؑ کا اس سے کہیں زیادہ احترام کریں اور ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت کریں جتنا کہ "عام وِلا" کا تقاضا ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیات اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بہت سی احادیث سے جو شیعہ اور سُنی مآخذ سے ہم تک پہنچی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اہلِ بیت اور خصوصاً امام علی علیہم السلام سے محبت کرنا اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔

اِس سلسلے میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں :

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اہلِ بیتؑ کا احترام کریں اور ان سے محبت کریں، نیز اس محبّت کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ کیوں قرار دیا گیا ہے؟ بالفرض اگر تمام لوگ اہلِ بیتؑ کی معرفت حاصل کرلیں اور ان سے محبت کرنے لگیں تو اس کا عملی فائدہ کیا ہوگا؟ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، تمام اسلامی تعلیمات کی بنیاد کسی نہ کسی حکمت اور فلسفے پر ہے۔ اگر اہلِ بیتؑ سے محبّت اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہے تو پھر اس حکم کے پیچھے بھی کوئی فلسفہ کارفرما ہوگا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ سے محبّت کی تلقین

واقعی ایک فلسفے کی حامل ہے۔ یہ نہ تو کوئی فضول مطالبہ ہے اور نہ ہی رسولِ اکرمؐ یا اہلِ بیتؑ کے فائدے کے لیے ہے۔ قرآن مجید نے آنحضرتؐ کی زبانی بالصراحت کہا ہے کہ جو صلہ میں نے تم سے مانگا ہے (یعنی اہلِ بیتؑ سے محبّت) اس کا فائدہ خود تمھیں (یعنی مومنین کو) پہنچتا ہے۔

یہ محبّت اسلام کی مقرر کردہ "ولا" کی تمام دوسری قسموں کی تمہید ہے، جن کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

یہ محبّت لوگوں کو خاندانِ رسالتؐ سے وابستہ رکھتی ہے اور انھیں ان کی تعلیمات، سیرت اور کردار سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

ہم نے اپنی کتاب "جاذبہ[1] و دافعہ علی علیہ السلام" میں کردار سازی پر محبت اور بالخصوص اولیائے حق سے محبت کے اثرات کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے لہذا جو کچھ اس کتاب میں کہا گیا اس کی تکرار یہاں ضروری نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اہلِ بیتؑ کی محبت اہلِ تشیع کا خاصہ ہے یا تمام مسلمان اس پر ایمان رکھتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ محبّتِ اہلِ بیتؑ شیعوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ تمام اسلامی فرقے اسے اہمیت دیتے ہیں۔ امام شافعی جو اہلِ سنت کے ائمۂ اربعہ میں سے ایک ہیں،

---

[1] اس کتاب کا اردو ترجمہ "جامعہ تعلیمات اسلامی" عنقریب شائع کر رہی ہے۔

انھوں نے اپنے معروف اشعار میں یوں کہا ہے ؎

یَا رَاکِبًا قِفْ بِالْمُحَصَّبِ مِنْ مِنٰی
وَاھْتِفْ بِسَاکِنِ خَیْفِھَا وَالنَّاھِضٖ

سَحَرًا اِذَا فَاضَ الْحَجِیْجُ اِلٰی مِنٰی
فَیْضًا کَمُلْتَطِمِ الْفُرَاتِ الْفَائِضٖ

اِنْ کَانَ رِفْضًا حُبُّ اٰلِ مُحَمَّدٍ
فَلْیَشْھَدِ الثَّقَلَانِ اِنِّیْ رَافِضِیٖ

اے سوار! منیٰ کی سنگلاخ وادی میں کھڑا ہو جا اور صبح کے وقت یہاں رکنے والوں اور جانے والوں کو پکار ۔ جب کہ حجاج مشعر سے منیٰ کو اس کثرت سے آتے ہیں، جیسے دریائے فرات موجیں مارتا ہے۔ ان سے کہہ دے کہ اگر آلِ محمدؐ کی محبت رفض ہے تو جنّ و انس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔[1]

امام شافعی یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

یَا اٰلَ بَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ حُبُّکُمْ
فَرْضٌ مِّنَ اللّٰہِ فِی الْقُرْاٰنِ اَنْزَلَہٗ

یَکْفِیْکُمْ مِنْ عَظِیْمِ الْفَخْرِ اَنَّکُمْ
مَنْ لَّمْ یُصَلِّ عَلَیْکُمْ لَا صَلٰوۃَ لَہٗ

---

[1] فخر الدین رازی تفسیر کبیر جلد ۲۷ صفحہ ۱۶۶ ۔

اے اہلِ بیتِ رسولؐ! اللہ نے قرآن میں آپ
سے محبت واجب قرار دی ہے۔ یہ بات آپ کے
لیے باعث فخر ہے کہ جب تک آپ پر درود نہ
بھیجا جائے نماز صحیح نہیں ہوتی[1]
وہ مزید کہتے ہیں کہ

وَلَمَّا رَأَیْتُ النَّاسَ قَدْ ذَهَبَتْ بِهِمْ
مَذَاهِبُهُمْ فِیْ اَبْحُرِ الْغَیِّ وَالْجَهْلِ
رَکِبْتُ عَلَی اسْمِ اللّٰهِ فِیْ سُفُنِ النَّجَا
وَهُمْ اَهْلُ بَیْتِ الْمُصْطَفٰی خَاتَمِ الرُّسُلِ
وَاَمْسَکْتُ حَبْلَ اللّٰهِ وَهُوَ وِلَائُهُمْ
کَمَا قَدْ اُمِرْنَا بِالتَّمَسُّكِ بِالْحَبْلِ

"لوگوں نے مختلف راستے اختیار کیے ہیں جس
کی وجہ سے وہ گمراہ ہوگئے ہیں۔ میں اللہ کا نام لے
کر ایک ایسی کشتی میں سوار ہوگیا ہوں جو مجھے صحیح
وسالم کنارے پر لگا دے گی، وہ کشتی اہلِ بیتِ رسولؐ
ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی
سے تھام لیں، وہ رسی ان (اہلِ بیتؑ) کی "ولا" ہے
اور میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا ہے۔"[2]

---

[1] محدث قمی، الکنیٰ والالقاب ۔ شبلنجی، نورالابصار صفحہ ۱۰۴۔
[2] محدث قمی، الکنیٰ والالقاب ۔

جار اللہ زمخشری اور فخر الدین رازی کہ جو خلافت کے مسئلے پر شیعوں کی شدید مخالفت کرتے ہیں، انھوں نے اپنی تفاسیرِ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"مَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَّاتَ شَہِیْدًا* اَلَا وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَّاتَ مَغْفُوْرًا لَّہٗ * اَلَا وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَّاتَ تَآئِبًا* اَلَا وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَّاتَ مُؤْمِنًا مُّسْتَکْمِلَ الْاِیْمَانِ.

جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ شہید کی موت مرتا ہے، جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ مغفور کی موت مرتا ہے، جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ تائب کی موت مرتا ہے، جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ مومن اور کامل الایمان شخص کی موت مرتا ہے۔"[1]

---

[1] فخر الدین رازی، تفسیر کبیر جلد ۲۷ صفحہ ۱۶۶ - جار اللہ زمخشری، تفسیر کشاف جلد ۴ - سورۂ شوریٰ کی ۲۳ ویں آیت کی تفسیر۔

امام علی علیہ السلام نے بھی اس بارے میں فرمایا ہے:

مصر کا مشہور عارف اور غزل گو شاعر ابن فارض، جسے عربی ادبیات میں وہی رتبہ حاصل ہے جو فارسی زبان میں خواجہ حافظ کا ہے، اپنی ایک معروف غزل میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

ذَهَبَ الْعُمْرُ ضِيَاعاً وَّانْقَضٰى
بَاطِلاً اِنْ لَّمْ اَفُزْ مِنْكَ بِشَيْ
غَيْرَ مَا اَوْلَيْتُ مِنْ عَقْدِيْ وِلَاءْ
عِتْرَةِ الْمَبْعُوْثِ حَقّاً مِّنْ قُصَيْ

"فَاِنَّهُ مَنْ مَّاتَ مِنْكُمْ عَلٰى فِرَاشِهٖ وَهُوَ عَلٰى مَعْرِفَةِ حَقِّ رَبِّهٖ وَحَقِّ رَسُوْلِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ مَاتَ شَهِيْدًا وَّوَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَاسْتَوْجَبَ ثَوَابَ مَا نَوٰى مِنْ صَالِحِ عَمَلِهٖ وَقَامَتِ النِّيَّةُ مَقَامَ اَصْلَاتِهٖ لِسَيْفِهٖ."

جو شخص اپنے بستر پر مرے لیکن اللہ، اس کے رسولؐ اور اہلِ بیتؑ کے حقوق پہچانتا ہو وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ میدانِ جنگ میں شہید ہوا ہو۔ اسے اس کی نیک نیتی کی جزا دی جائے گی اور یوں سمجھا جائے گا جیسے کہ اس نے شمشیر بکف جنگ لڑی ہو۔"

(مفتی جعفر حسینؒ، ترجمہ نہج البلاغہ۔ آخر خطبہ ۱۸۸)

"اے پروردگار! اگر میں تیری خوشنودی حاصل
نہ کرسکوں تو میری زندگی بے مصرف اور بیکار
گزرے گی۔ اب (تیری خوشنودی حاصل کرنے کے
لیے) میرے پاس ایک چیز کے سوا اور کچھ نہیں
اور وہ چیز "ولا" کا وہ پیوند ہے جو میں نے قصیٰ
کی اولاد میں سے مبعوث ہونے والے سچے پیغمبرؐ
کے اہلِ بیتؑ سے جوڑ رکھا ہے۔"

ممکن ہے کہ لفظ "ولا" سے ابن فارض کی مراد کوئی زیادہ بلند معنیٰ ہوں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے یہ لفظ "ولائے قرابت" کے لیے استعمال کیا ہے۔

عبدالرحمٰن جامی نے فرزدق کے اس معروف قصیدے کا منظوم فارسی ترجمہ کیا ہے جو اس نے حضرت سجّاد علیہ السلام کی مدح میں پڑھا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ فرزدق کی وفات کے بعد کسی نے اسے خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ اللہ نے تجھ سے کیا سلوک کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے جو قصیدہ حضرت علی بن حسین علیہم السلام کی مدح میں کہا تھا اس کی بنا پر اللہ نے میرے گناہ معاف کر دیے۔

خود جامی بھی اس روایت پر اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس قصیدے کی خاطر تمام لوگوں کو بخش دے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

ہشام بن عبدالملک نے مذکورہ قصیدے کی بنا پر فرزدق کو قید

کر دیا اور شکنجے میں کسا، جامی اس سلسلے میں کہتے ہیں ؎

اگرش چشم راست بین بودی
راست کردار و راست دین بودی
دست بی داد و ظلم نگشادی
جامی آن حبس خلعتش دادی

اگر ہشام کی آنکھ سچائی کو دیکھ سکتی اور وہ ایک نیک کردار اور باایمان شخص ہوتا تو فرزدق پر ظلم نہ ڈھاتا اور قید کرنے کی بجائے اسے خلعت دیتا۔ [1]

پس ثابت ہوگیا کہ اہلِ تشیع اور اہلِ تسنّن میں ولائے عترتِ پیغمبر ص کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، صرف ناصبی ہی اہلبیتِ رسول ص سے بغض رکھتے ہیں تاہم پوری ملّتِ اسلامیہ انھیں مردود و مطرود سمجھتی ہے اور کفار کی طرح نجس گردانتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ موجودہ دور میں دنیا ان کے وجود کی نجاست سے پاک ہوگئی ہے۔ ہاں بعض اوقات ان میں سے معدودے چند افراد دیکھنے میں آتے ہیں جو کبھی کبھار کتابیں لکھتے ہیں اور ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں نااتفاقی پیدا کریں۔ اس قسم کے کچھ لوگ خود ہمارے اپنے درمیان بھی پائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں نااتفاقی پھیلائیں وہ

---

[1] سلسلۃ الذہب۔

خواہ اپنے آپ کو شیعہ کہیں یا سُنّی، سب کے سب استعمار کے آلۂ کار ہیں۔

زمخشری اور رازی رسولِ اکرمؐ کی مذکورہ بالا حدیث نقل کرنے کے فوراً بعد آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث نقل کرتے ہیں جس کی عبارت یہ ہے:

اَلَا وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ کَافِرًا اَلَا وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ لَمْ یَشُمَّ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ۔

جو شخص اس حالت میں مرے کہ اہلِ بیتِ رسولؐ کے لیے دشمنی رکھتا ہو وہ کافر مرتا ہے اور بہشت کی بُو تک بھی نہیں سونگھے گا۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"فَاِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی لَمْ یَخْلُقْ خَلْقًا اَنْجَسَ مِنَ الْکَلْبِ وَاِنَّ النَّاصِبَ لَنَا اَھْلَ الْبَیْتِ لَاَنْجَسُ مِنْهُ۔

اللہ نے کوئی چیز کتّے سے زیادہ نجس پیدا نہیں کی لیکن جو شخص ہم اہلِ بیتؑ سے دشمنی رکھے وہ کتّے سے بھی زیادہ نجس ہے۔" [۱]

اگر اس قسم کی "وِلا" کو اہلِ بیتؑ سے نسبت دی جائے اور

---

[۱] وسائل الشیعہ جلد ا صفحہ ۱۵۹ نیا ایڈیشن۔

انھیں "صاحب ولا" کہا جائے تو یہ "ولائے قرابت" کہلائے گی اور اگر اسے اس ذمّہ داری کے پیش نظر جو مسلمانوں پر اہل بیتؑ سے محبت کے بارے میں عائد ہوتی ہے، اسے مسلمانوں سے نسبت دی جائے تو پھر اسے "ولائے محبت" کہیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ "وِلا" کا مادہ اور اس کے مشتقات محبت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں بالخصوص زیارات میں مُوَالٍ کا لفظ دوست کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے مثلاً مُوَالٍ لِّمَنْ وَّالَاکُمْ وَ مُعَادٍ لِّمَنْ عَادَاکُمْ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان لوگوں کا دوست ہوں جو آپ سے محبّت کرتے ہیں اور ان لوگوں کا دشمن ہوں جو آپ کے دشمن ہیں۔

دو اور نکات بحث طلب ہیں:

ایک یہ کہ آیا لفظ وَلِی بالخصوص دوست کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے یا نہیں؟

اور دوسرا یہ کہ لفظ وَلِی بالخصوص آیت کریمہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ جو امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کی ولایت ثابت کرتی ہے اس میں کن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "وِلَا" قرآن مجید میں ہمیشہ دوست کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن اگر اس کے استعمال پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے معنیٰ مختلف ہیں۔ مثلاً

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۷)

اِس آیت میں اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ اللہ اہلِ ایمان کا دوست ہے، بلکہ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ اللہ اپنی خاص عنایت اور تصرف سے اہلِ ایمان کا خیال رکھتا ہے اور وہ اس کی حمایت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

یا یہ آیت:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (سورۂ یونس - آیت ۶۲)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کے دوستوں کو کسی چیز کا خوف نہیں۔ یہاں لفظ "ولی" فعیل کے زمرے میں آتا ہے اور مفعول کے معنوں میں ہے۔ لہٰذا آیتِ مبارکہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کی حفاظت کرتا ہے، انھیں کسی چیز کا خوف نہیں ہوتا۔

یہی صورت مندرجہ ذیل آیت کی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ. (سورۂ توبہ - آیت ۷۱)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مومنین ایک دوسرے کے دوست ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مقدر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر اس سے اگلی آیت میں کہا گیا ہے:

يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اِس بیان سے سوال کے دوسرے حصے کا جواب واضح ہوجاتا

ہے۔ زیرِ غور آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ، رسولِ اکرمؐ اور امام علی علیہ السلام مومنین کے دوست ہیں بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اگر فرض کر لیا جائے کہ "دوست" کے معنوں میں لفظِ ولی کا استعمال صحیح ہے، تب بھی یہ معنیٰ اس آیت کے سیاق و سباق سے مطابق نہیں رکھتے کیونکہ یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ فقط اللہ، رسول اکرمؐ اور امام علیؑ مسلمانوں کے دوست ہیں۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ بعض سُنّی مفسرین کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس آیت کا مفہوم کچھ زیادہ اہم نہیں بلکہ فقط یہ ہے کہ امام علی علیہ السلام مومنین کے دوست ہیں یا یہ کہ وہ امام علیؑ کو دوست رکھیں اور ان سے محبّت کریں۔

دراصل آیتِ ولایت میں ولی کا لفظ محض محبّت کے معنوں میں نہیں بلکہ اس سے بلند تر معنوں میں استعمال ہوا ہے اس نکتے کی وضاحت آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

ولائے امامت

ولائے امامت یا بالفاظِ دیگر "مرجعیتِ دینی" وہ منصب ہے جو امام کو ان دوسرے لوگوں کے لیے بطورِ نمونہ پیش کرتا ہے جنھیں اس کی پیروی کرنا ہوتی ہے اور اس سے ہدایت لینی ہوتی ہے، یہ منصب خود بخود امام کی عصمت پر دلالت کرتا ہے اور یہ وہی منصب ہے جس کے متعلق قرآن مجید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا.

رسول اللہؐ کی سیرت تم میں سے ان لوگوں کے لیے بہترین نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید

رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

(سورۂ احزاب۔آیت ۲۱)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ.

اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ پھر اللہ بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔

(سورۂ آلِ عمران۔آیت ۳۱)

قرآن مجید کی یہ آیات رسولِ اکرمؐ کو بطورِ نمونہ پیش کرتی ہیں تاکہ لوگ ان کی پیروی کریں اور اپنا کردار ان کے کردار کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ یہ چیز بجائے خود آنحضرتؐ کی عصمت کا ثبوت ہے کیونکہ جس شخص سے غلطی اور گناہ سرزد ہونے کا امکان ہو، خدائے تعالیٰ اسے پیشوا کے طور پر متعارف نہیں کراتا۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد یہ منصب اہلِ بیتؑ کو حاصل ہوا[۱]

بہت سے سنی علماء نے اپنی حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تقریباً تیس صحابہ کے حوالے سے آنحضرتؐ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کے مطابق آپ نے فرمایا ہے:

---

[۱] اس موضوع پر علامہ محقق مرتضیٰ عسکری کی کتاب "احیائے دین میں ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام کا کردار" دیکھیے۔

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ : کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ ، وَاِنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ . فَلَا تُقَدِّمُوْھُمَا فَتَھْلِکُوْا وَلَا تُقَصِّرُوْا عَنْھُمَا فَتَھْلِکُوْا ، وَلَا تُعَلِّمُوْھُمْ فَاِنَّھُمَا اَعْلَمُ مِنْکُمْ .

میں تمھارے درمیان دو بیش قیمت چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں : ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اہلِ بیت ۔ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے حتیٰ کہ حوضِ کوثر پر مجھ سے آملیں گے ۔ اگر تم ان سے آگے بڑھو گے یا ان سے پیچھے رہ جاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے ۔ انھیں پڑھانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں ۔

یہاں رسولِ اکرمؐ نے اہلِ بیتؑ کو اللہ کی کتاب کا ساتھی اور ہم پلّہ قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے بارے میں فرماتا ہے :

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ .

باطل نہ تو اس کے آگے سے پھٹک سکتا ہے

لہ اس حدیث کے اسناد میں آقائے قوام الدین جاسبی کا رسالہ ملاحظہ ہو ، جو دارالتقریب بین المذاہب الاسلامیہ نے شائع کیا ہے ۔

اور نہ پیچھے سے۔ (سورۂ فصّلت - آیت ۴۲)

پس اگر اہلِ بیتؑ بھی باطل کے قریب جا سکتے ہوں تو وہ قرآن مجید کے ہم پلّہ کیونکر قرار پاتے ؟ اسی طرح اگر وہ معصوم نہ ہوتے تو امتِ مسلمہ کی پیشوائی کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جانشین نہیں قرار پا سکتے تھے۔ حدیث کے مضمون سے واضح ہے کہ اس کے مصداق چند معصوم اشخاص ہیں۔ جیسا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے کہا ہے کہ اہلِ بیتؑ کے علاوہ نہ کوئی معصوم ہے اور نہ ہی کسی کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا اطلاق فقط ائمۂ اہلِ بیتؑ پر ہوتا ہے۔

ابن حجر ہیثمی کہتے ہیں :

رسول اکرمؐ نے لوگوں سے فرمایا : "اگر وہ اہلِ بیتؑ سے آگے بڑھیں گے یا ان سے پیچھے رہ جائیں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "لوگوں کو چاہیے کہ انھیں پڑھائیں نہیں کیونکہ وہ دوسروں سے بہتر جانتے ہیں۔"

رسولِ اکرمؐ کا یہ ارشاد اس امر کی دلیل ہے کہ اہلِ بیتؑ میں جو لوگ اعلیٰ علمی مراتب پر پہنچے، وہ دینی پیشوائی کے اہل اور دوسروں سے برتر تھے۔[1]

حافظ ابونعیم کہتے ہیں : ابن عباس سے روایت ہے کہ رسولِ اکرمؐ

---

[1] الصواعق المحرقۃ صفحہ ۱۳۵

نے فرمایا:

"جو شخص میری طرح جینا اور میری طرح مرنا چاہے اسے چاہیے کہ میرے بعد علیؑ کو اپنا ولی منتخب کرے اور میرے خاندان سے تعلق رکھنے والے اماموں کی پیروی کرے کیونکہ انھیں فہم ودانش سے نوازا گیا ہے۔ وہ لوگ بڑے بدنصیب ہیں جو ان کی فضیلت سے انکار کرتے ہیں اور میری ان سے رشتہ داری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کیونکہ انھیں میری شفاعت میسّر نہ ہوگی۔"[1]

ایسی دینی پیشوائی جو پیشوا کے ہر قول اور فعل کو مستند اور حجّتِ الٰہی قرار دے، امامت کہلاتی ہے۔ یہ ان معنوں میں ایک قسم کی ولایت ہے کہ اس میں لوگوں کے معاملات میں تسلّط، تدبّر اور تصرّف کا حق مضمر ہے۔

عام قاعدے کے مطابق ہر معلّم اور مربّی اپنے شاگردوں اور زیرِ تربیت لوگوں پر اختیار رکھتا ہے اور یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ جو معلّم اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو، اس کے اختیارات نسبتاً زیادہ ہونے چاہئیں۔

قرآن کہتا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا

---

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ا صفحہ ۸۶۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰاكِعُوْنَ۔

تمہارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔

(سورۂ مائدہ - آیت ۵۵)

یہ آیت اسی قسم کی ولایت سے مناسبت رکھتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ "ولایت" کی بعض دوسری اقسام پر حاوی نہیں، جن کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ آیت امامت پر بھی محیط ہے نیز رسولِ اکرمؐ کی کئی احادیث میں بھی "ولی" کا لفظ "امام" کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس قسم کی "وِلا" کا ذکر جب امام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کیا جائے تو اس سے مراد دینی اختیار اور پیشوائی کا حق ہے اور اگر اسے مسلمانوں سے نسبت دی جائے تو اس کا مطلب اس حق کو تسلیم کرنا ہے۔

ولائے زعامت

ولائے زعامت کے معنیٰ سماجی اور سیاسی پیشوائی کے حق کے ہیں۔ بلاشبہ ہر معاشرے کو ایک قائد کی ضرورت ہوتی ہے جو شخص مملکت کے امور کی ذمہ داری سنبھالے اور لوگوں کے معاملات کا مختار ہو اسے "ولی امر المسلمین" کہا جاتا ہے۔ اپنی ظاہری زندگی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس عہدے کے حامل تھے اور یہ انھیں اللہ تعالیٰ نے تفویض کیا تھا۔ ان کے وصال کے بعد یہ حیثیت اہلِ بیتؑ کو حاصل ہوئی۔ اس قول کو ثابت کرنے کے لیے ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں۔ بہت سی قرآنی آیات اس قسم کی "ولایت" کی جانب اشارہ کرتی ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ.

اے ایمان والو! خدا کی اور رسولؐ کی اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے اولو الامر ہوں۔ (سورۂ نساء - آیت ۵۹)

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ.

تمہارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔

(سورہ مائدہ - آیت ۵۵)

اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ.

نبیؐ مومنین پر خود ان کے نفسوں سے بھی زیادہ تصرّف کا حق رکھتے ہیں۔

(سورۂ احزاب - آیت ۶)

ان آیات کے علاوہ "حدیثِ غدیر" بھی "ولائے زعامت" کے وجود کو ثابت کرتی ہے۔

پھر اس بارے میں بھی کوئی اختلافِ رائے نہیں کہ رسولِ اکرمؐ اس رتبے کے حامل ہیں اور یہ ایک الٰہی شان یعنی ایسا حق ہے جو بندوں نے نہیں بلکہ خدا نے آپ کو عنایت کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے سنی بھائی بھی اس بارے میں ہم سے متفق ہیں۔ اب جو سوال بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کون اس رتبے پر فائز ہے۔

انتشار اور افراتفری سے محفوظ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو مسلمانوں کے امور کا انتظام چلائے اور وہ اس کی اطاعت کریں۔ کیا اسلام نے اس بارے میں کوئی طریقِ کار وضع کیا ہے ؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو وہ طریقِ کار کیا ہے ؟ کیا لوگوں کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ کے بعد جسے جی چاہے منتخب کرلیں اور دوسروں پر اس کی اطاعت واجب ہو ؟ یا یہ کہ آنحضرتؐ نے ایک مخصوص شخص کو اپنا جانشین نامزد کردیا ؟

اس سلسلے میں ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے اپنی امّت کے معاشرتی معاملات کے متعلق کیا کام انجام دیے ؟ اور آپ کو امّت پر کون کون سے اجتماعی اختیارات حاصل تھے ؟

قرآن سے اور حضورؐ کی سیرت اور سنت سے پتا چلتا ہے کہ آپ بیک وقت تین عہدوں کے حامل تھے :

اوّلاً یہ کہ آپ امام اور رہبر اور مرجعِ دینی کی حیثیت رکھتے تھے اور امامت کے حامل تھے۔ آپ جو کچھ کہتے یا کرتے وہ حجّت ہوتا تھا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا .

رسولؐ تمھیں جس بات کا حکم دیں مان لو اور

جس بات سے روکیں رک جاؤ۔

(سورۂ حشر۔ آیت ۷)

ثانیاً یہ کہ آپ ولایتِ قضائی کے عہدے پر فائز تھے یعنی یہ کہ اندرونی جھگڑوں اور مقدموں کے بارے میں آپ کے فیصلے قطعی ہوتے تھے اور ہر ایک پر ان کی پابندی لازمی تھی۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا.

اے رسولؐ! تمہارے پروردگار کی قسم کہ یہ لوگ سچے مؤمن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں اپنا حَکَم نہ بنائیں۔ پھر جو فیصلہ تم کرو اس سے ان کے دل ملول نہ ہوں بلکہ وہ اسے بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۶۵)

گو ولایت کے لفظ کا ان معنوں میں استعمال درست ہے لیکن عملی طور پر اس کا "ولایتِ قضائی" کی شکل میں استعمال ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

ثالثاً یہ کہ آپ سیاسی اور سماجی ولایت کے حامل تھے۔ احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور تشریح کرنے اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے علاوہ آپ مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی معاملات کا اہتمام بھی فرماتے تھے، کیونکہ آپ مسلمانوں کے "ولی الامر" تھے۔ مندرجہ ذیل آیات آپ کے اختیارات کے اس پہلو کی جانب اشارہ

کرتی ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ.

اے ایمان والو! خدا کی اور رسولؐ کی اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے ولی الامر ہوں۔

(سورۂ نساء - آیت ۵۹)

اَلنَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ.

نبیؐ مومنوں پر خود ان کے نفسوں سے بھی زیادہ تصرّف کا حق رکھتے ہیں۔

(سورۂ احزاب - آیت ۶)

رسولِ اکرمؐ کا ایک چوتھا عہدہ بھی تھا، جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

رسول اکرمؐ لوگوں پر حکومت کرتے تھے اور سیاسی اور سماجی معاملات میں ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔

قرآن کہتا ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا.

اے رسولؐ! تم ان کے مال کی زکات لو اور (یوں) ان کو گناہوں سے پاک صاف کردو۔

(سورۂ توبہ - آیت ۱۰۳)

یہ آیت بتاتی ہے کہ نبی اکرمؐ لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے

اور ان کے مالی اور اقتصادی معاملات کا اہتمام کرتے تھے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی حیثیت ہے، جو خلافت کے مسئلے کی بنیاد ہے۔

یہاں اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ جس طرح امام کا لفظ ان مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن سے علمِ دین حاصل کیا جائے (اور اہل سنت ابو حنیفہ، شافعی، مالک اور احمد بن حنبل کے لیے امام کا لفظ انھی معنوں میں استعمال کرتے ہیں) اسی طرح یہ لفظ سیاسی اور سماجی پیشواؤں کے لیے بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"ثَلَاثٌ لَا يُغَلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ: إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ، وَالنَّصِيحَةُ لِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ، وَاللُّزُومُ لِجَمَاعَتِهِمْ."

"مسلمانوں کا دل تین چیزوں کے بارے میں خیانت کو گوارا نہیں کرسکتا:

۱ ۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص عمل۔

۲ ۔ مسلمان حاکموں کے لیے خیر خواہی۔

۳ ۔ مسلمانوں کی جماعت کی ہمراہی۔"[۱]

امام علی علیہ السلام ایک خط میں فرماتے ہیں:

---

[۱] کافی جلد ۱ صفحہ ۴۰۳

فَاِنَّ اَعۡظَمَ الۡخِیَانَۃِ خِیَانَۃُ الۡاُمَّۃِ وَاَفۡظَعُ الۡغِشِّ غِشُّ الۡاَئِمَّۃِ۔

قوم کو دھوکا دینا سب سے بڑی خیانت ہے
اور اماموں سے دغا کرنا بدترین دغابازی ہے۔ [1]

یہ امر بدیہی ہے کہ اماموں سے دغا کرنے کے معنی تمام مسلمانوں سے دغا کرنے کے ہیں۔ اگر کوئی شخص جہاز کے کپتان کو دھوکا دے کر جہاز کو خطرے میں ڈال دیتا ہے تو دراصل وہ جہاز میں سوار تمام لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے کہ امام علی علیہ السلام کے مذکورہ خط میں امام کا لفظ سماجی اور سیاسی لیڈر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تاریخ اسلام پر لکھی گئی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان۔ حتیٰ کہ ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام بھی۔ اپنے ہم عصر خلفاء کو امام کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ ان معنوں میں امام ۔ عادل بھی ہو سکتا ہے اور ظالم بھی اور ان دونوں کے بارے میں مسلمانوں پر کچھ ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

ایک معروف حدیث کے مطابق جسے سنی اور شیعہ دونوں صحیح تسلیم کرتے ہیں، رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

اَفۡضَلُ الۡجِہَادِ کَلِمَۃُ عَدۡلٍ عِنۡدَ اِمَامٍ جَائِرٍ
سب سے بڑا جہاد ایک ظالم امام کے سامنے سچّی

---

[1] نہج البلاغہ۔ خط نمبر ۳۶۔

بات کہہ دیتا ہے۔"

ایک اور حدیث کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"آفَةُ الدِّینِ ثَلاثَةٌ: اِمَامٌ جَائِرٌ وَمُجْتَهِدٌ جَاهِلٌ وَعَالِمٌ فَاجِرٌ.

تین اشخاص دین کو نقصان پہنچاتے ہیں:-

ظالم حاکم، نادان عابد اور بدکردار عالم۔"

علاوہ ازیں خود قرآن مجید بھی ایسے اماموں کا ذکر کرتا ہے جو دوزخ کی جانب دعوت دیتے ہیں:

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ

ہم نے انھیں ایسے امام قرار دیا ہے جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ (سورۂ قصص۔آیت ۴۱)

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ "امام" عموماً عادل اور راستباز پیشواؤں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اہلِ تشیّع کی اصطلاح میں اِمام فقط ان معصوم اور برحق پیشواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن کی تعداد بارہ ۱۲ ہے۔

ولائے تصرّف

ولائے تصرف یا ولائے معنوی یا ولائے تکوینی "ولایت" کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ ولایت کی تمام دوسری اقسام سے اہلِ بیتؑ کا تعلق یا تو ان کی ذاتی طہارت و قداست کے علاوہ رسولِ اکرمؐ سے قرابت کی بنا پر ہے یا ان کی اپنی علمی اور اجتماعی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔ تاہم ان دونوں صورتوں میں یہ ولایت اصول اور احکام کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ لیکن ولایتِ تصرف یا ولایتِ معنوی ایک قسم کی غیر معمولی اور خداداد قوت اور اختیار پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ ولایتِ تصرف پر اعتقاد رکھتے ہیں، ان کی نظر میں اس کی کیا اہمیت اور کیا مفہوم ہے؟

ولایتِ تکوینی کا تعلق ایک طرف تو حصولِ کمال کی اُن

صلاحیتوں سے ہے جو انسان میں پوشیدہ ہیں اور دوسری طرف اس رابطے سے ہے جو انسان اور اللہ کے درمیان موجود ہے۔

ولایتِ تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ بندگی کی راہ پر چلتے چلتے انسان قربِ الٰہی کا مقام حاصل کرلیتا ہے اور قرب کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی روحانیت جو بجائے خود ایک حقیقت ہے، اس کے اندر سمٹ جاتی ہے۔ تب وہ رُوحانیت کے قافلے کا سالار، لوگوں کے ضمیر کا حاکم، ان کے افعال کا شاہد اور اپنے دور کے لیے حُجّت بن جاتا ہے۔ دنیا کبھی ایسے روحانی پیشوا سے خالی نہیں رہی، دُوسرے الفاظ میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک انسانِ کامل دنیا میں موجود نہ رہا ہو۔

اِن معنوں میں۔ وِلَایَتؑ۔ نبوّت، وصایت اور امامت (دینی احکام میں مرجعیت) سے مختلف چیز ہے۔ تاہم اس کا نبوت، خلافت اور وصایت سے مختلف ہونا حقیقی ہے، لیکن امامت سے مختلف ہونا محض تصوراتی اور برائے نام ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ولایت کا نبوّت، خلافت اور وصایت سے مختلف ہونا حقیقی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک نبی یا اس کا وصی یا جانشین ولی نہیں ہوسکتا۔ اس کا تو مطلب صرف یہ ہے کہ نبوّت اور اسی طرح خلافت اور وصایت کی ماہیت ولایت سے مختلف ہے ورنہ اولوالعزم انبیاءؑ اور بالخصوص حضرت خاتم النبیینؐ مکمل ولایت کے حامل رہے ہیں۔

پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ولایت کا امامت سے مختلف

ہونا محض تصوراتی ہے تو اس سے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو ایک لحاظ سے امامت اور ایک لحاظ سے ولایت کہلاتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں لفظ "امامت" اکثر اسی ولایتِ معنوی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس کے وسیع معنوں میں "امامت" پیشوائی کو کہا جاتا ہے۔ ایک دینی قائد، ایک سیاسی اور سماجی لیڈر اور ایک روحانی رہنما سبھی کو پیشوا کہا جاسکتا ہے۔

شیعہ نقطۂ نگاہ سے ولایت کے تین[3] رُخ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے لفظ "امامت" استعمال ہوا ہے:-

۱۔ اس کا پہلا رخ سیاسی ہے، سوال یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کا جانشین اور مسلمانوں کا سیاسی اور سماجی قائد بننے کے لیے کون شخص سب سے زیادہ موزوں اور قابل تھا؟ حضرت رسولِ اکرمؐ نے خود اس عہدے پر امام علی علیہ السلام کا تقرر حکمِ خدا سے کیا تھا۔ تاہم موجودہ زمانے میں اس مسئلے کی اہمیت عملی نہیں بلکہ محض اعتقادی اور تاریخی ہے۔

۲۔ دُوسرا رخ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے بعد دینی مسائل کے بارے میں کن اشخاص سے رجوع کیا جائے؟ وہ اشخاص کس ذریعے سے علم حاصل کرتے ہیں؟ وہ احکام کے بیان کرنے میں معصوم ہیں یا نہیں؟

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ائمۂ اثنا عشر[ع] معصوم ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے اعتقادی اور

عملی دونوں پہلو ہیں۔

۳ - ولایت کا تیسرا رخ معنوی اور باطنی ہے۔ شیعوں کے عقیدے کے مطابق ہر دور میں ایک ایسا کامل انسان ہوتا ہے جو دنیا اور انسانوں پر تکوینی تسلّط رکھتا ہے اور اس کو دلوں اور روحوں پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا نام "حجّت" ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے، کچھ بعید نہیں کہ قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ.

نبی اکرمؐ مومنین پر ان کے نفسوں سے بھی زیادہ تصرف کا حق رکھتے ہیں۔

(سورۂ احزاب۔ آیت ۶)

کا اشارہ ولایت کے انھی معنوں کی طرف ہو۔

ولایتِ تصرف یا ولایتِ تکوینی کا یہ مطلب نہیں، جیسا کہ بعض ناواقف سمجھتے ہیں کہ کوئی انسان کائنات میں اللہ تعالیٰ کے نمائندے کے طور پر پیدا کرنے، روزی دینے، زندگی بخشنے اور موت دینے کے فرائض انجام دینے کی قوت حاصل کرسکتا ہے، ہرگز نہیں!

اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام علّت اور معلول کے اصول کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ نیز وہ موجودات کہ جنھیں قرآن مجید مَلٰٓئِکَہ کہتا ہے، ان کو بہ اذنِ خدا

فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا۔
پھر دنیا کا انتظام کرتے ہیں۔
(سورہ نازعات - آیت ۵)

اور

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا۔
پھر ایک ضروری چیز (بارش) کو تقسیم کرتی ہیں
(سورۂ ذاریات - آیت ۴)

کہا گیا ہے۔ لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کے بحیثیت مالک اور خالق، لاشریک ہونے کے منافی نہیں ہے کہ کوئی موجود بھی اللہ کے ساتھی مددگار حتیٰ کہ "ذریعۂ فعل" کی حیثیت سے اس کا ولی نہیں ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔
سلطنت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں اور نہ ہی اسے کسی طرح کی کمزوری ہے کہ کوئی اس کا سرپرست ہو، تو اس کی بڑائی اچھی طرح کرتے رہا کرو۔ (سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۱۱۱)

مخلوق کی خالق سے اس کے علاوہ اور کوئی نسبت نہیں کہ وہ خالق کے مقابلے میں مخلوق ہے اور مکمل طور پر اُس کا محتاج اور لاشئی ہے۔

قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ مکمل طور پر غنی اور بے نیاز ہے۔ تاہم جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ
اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا۔

اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی
روحیں اپنی طرف کھینچ بلاتا ہے۔
(سورہ زمر - آیت ۴۲)

وہاں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ
قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ
وُكِّلَ بِكُمْ. ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ.

اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ ملک الموت جو
تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں
قبض کرے گا۔ پھر تم سب کے سب اپنے پروردگار
کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (سورہ سجدہ - آیت ۱۱)

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ. (سورہ نحل - آیت ۲۸)

اور اسی طرح جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ
اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ.
بلاشبہ میرا پروردگار ہر چیز کا نگہبان ہے۔
(سورہ ہودؑ - آیت ۵۷)

وہاں یہ بھی کہتا ہے کہ
وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً. حَتّٰٓى اِذَا
جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا.

وہ تم لوگوں پر نگہبان (فرشتے) تعینات کرتا
ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت

آئے تو ہمارے فرستادہ (فرشتے) اسے دنیا سے اُٹھا لیتے ہیں۔ (سورۂ انعام۔آیت ۶۱)

اِس آیت میں بھیجے جانے والوں (فرشتوں) کو بطور نگہبان اور پھر بطور رُوحیں قبض کرنے والوں کے متعارف کرایا گیا ہے۔

اندریں صورت پہلی بات یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کے لحاظ سے واسطوں کی موجودگی کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں اور نہ ہی اس چیز میں کوئی حرج ہے کہ کوئی شخص اللہ کی اجازت سے اس کی مرضی کے مطابق کوئی کام سرانجام دے۔ تاہم اسلامی شائستگی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم پیدا کرنے، روزی دینے، زندگی بخشنے اور موت دینے جیسے کام اللہ کے علاوہ کسی اور سے منسوب نہ کریں اور اپنی توجہ اس اصلی منبعِ قدرت کی جانب مبذول رکھیں جو کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ یہ واسطے اور فرشتے محض اللہ کی مخلوق اور اس کی عظیم قوّت اور حکمت کا مظہر ہیں۔

کائنات کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر طریقہ وضع فرمایا ہے جس میں فرشتوں کو واسطہ قرار دیا گیا ہے۔ گو ارتقائی منازل طے کر کے انسان فرشتوں سے بھی اونچا رتبہ حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن وہ ان کی بجائے بطور واسطہ جگہ نہیں لے سکتا۔ وحی ہمیشہ فرشتے کے ذریعے نازل کی جاتی ہے اور ایک فرشتہ ہی ہے جسے ہر شخص کی روح قبض کرنے پر مامور کیا گیا ہے اور فرشتے ہی انسان کی حفاظت پر مامور ہیں۔

دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ایک کامل یا نسبتاً کامل انسان کی ولایتِ تصرّف یا ولایتِ تکوینی کی حدود کا صحیح صحیح تعین نہیں کر سکتے۔ تمام قرآنی اور علمی قرینے جو ہمیں دستیاب ہیں ان سے اجمالاً پتہ چلتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں اس کا ارادہ دُنیا پر حکومت کرے۔ لیکن اس کے اِس تصرّف کی کیا حدود ہیں؟ اور آیا کوئی حدود ہیں بھی یا نہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہے۔

ایک تیسرا نکتہ کہ جس کا بیان ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ولایتِ تصرّف صرف اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس کے تسلّط سے قطعاً آزاد ہو۔ یہ ولایت کسی متکبّر اور خود غرض شخص کو نہیں مل سکتی اور ایک خودرائے شخص ایسے معجز آسا عہدے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس ولایت کا حامل ہو وہ اس قدر پاکیزہ اور طاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ارادے کے برعکس اس کا ارادہ اندرونی تحریک اور غیبی اشارے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تاہم ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ اس غیبی اشارے کی کیا نوعیت ہے اور وہ شخص اسے کس طرح حاصل کرتا ہے۔ بعض اوقات ایک غیبی روشنی ایسے اشخاص کی رہنمائی کرتی ہے جس کی بنا پر بہت سے راز ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انھیں معمولی باتوں تک کا پتا نہیں چلتا۔

قرآن میں آیا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔

(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ میں خود کو نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار ہی نہیں رکھتا۔

(سورۂ اعراف ۔ آیت ۱۸۸)

جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسولِ اکرمؐ سے یہ کہنے کو کہا جارہا ہے کہ تمام نفع و نقصان دراصل اللہ کے اختیار میں ہے، ورنہ یہ تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں دوسرے لوگ مخصوص حدود میں اپنے نفع اور نقصان پر اختیار رکھتے ہیں، اللہ کے رسولؐ کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہ ہو۔

یہ تین نکات تھے جن کا ذکر کرنا ولایتِ تکوینی کی مفصل بحث سے پہلے بطور تمہید ضروری تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم بحث کی جاتی ہے لیکن اب ہمارے نوجوانوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی ہے، اس لیے ہم اس بارے میں قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ولایت کا ان معنوں میں تسلیم کرنا قدرے دشوار ہے اور ہمارا روشن خیال طبقہ ایسے مسائل سے خوش نہیں ہوتا۔ وہ لوگ اکثر اعتراض کرتے ہیں کہ جب مسلمانوں کو کئی ایک اہم اور ضروری مسائل درپیش ہیں تو اس مسئلے پر بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ آیا رسولِ اکرمؐ اور ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام ولایتِ تکوینی کے حامل تھے یا نہیں؟ ان میں سے بعض اس

ولایت کا انکار کرتے ہوتے اسے مذہبی رنگ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ غلو ہے اور اس قسم کے تصرّف کو تسلیم کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ انسانوں کو مافوق البشر مان لیا جائے اور انھیں نیم دیوتا کا رتبہ دے دیا جائے، جب کہ خدا کے کام کو غیرِ خُدا کی طرف نسبت دینا شرک ہے اور یہ چیز توحیدِ الٰہی کے منافی ہے جو کہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے کسی بات کو قبول کرلیں یا رد کردیں۔ کیونکہ کسی نظریے کے شرک یا توحید پر مبنی ہونے کا انحصار ہمارے ارادے اور خواہش پر نہیں ہے کہ ہم جس چیز کو چاہیں شرک قرار دیں اور جسے چاہیں توحید کا نام دے دیں۔ بلکہ اس کے لیے بڑے دقیق قرآنی اور منطقی معیارات مقرر ہیں اور توحید و شرک سے متعلقہ مسائل کے بارے میں اسلامی علوم اتنی بلندی اور عظمت کے حامل ہیں کہ عام افراد اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اگرچہ بعض مسائل کا دوسروں کے مقابلے میں فوری اور ضروری ہونا بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، لیکن کسی مسئلے کے ضروری ہونے کا معیار فقط یہ نہیں ہے کہ ایک زمانے میں اسے زیادہ شد و مد سے پیش کیا جائے اور لوگ اس کی ضرورت کا زیادہ احساس کریں۔ دراصل یہ خیال کرنا ہی غلط ہے کہ ضرورتوں کا احساس خود ضرورتوں کے مطابق ہوتا ہے۔

غور کیجیے کہ اپنے مسائل اور معارف کو پیش کرتے وقت قرآن مجید جن مطالب پر زور دیتا ہے وہ بجائے خود ایک معیار ہے

جس سے ہر زمانے میں استفادہ کرنا چاہیے۔

ولایتِ تکوینی کا تعلق انسان اور اس کی صلاحیتوں سے ہے اور قرآن مجید انسان اور اس کی صلاحیتوں اور اس کی تخلیق کے غیر معمولی پہلو کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ انشاء اللہ ہم اپنی آئندہ تصنیف "قرآن اور انسان" میں اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ فی الحال مختصراً یہ بتانا کافی ہوگا کہ قرآن کا نظریہ ولایت کیا ہے، تاکہ بعض لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ محض ایک "قلندری" بات ہے۔

بعض اوقات اس قسم کے مسائل کا ادراک مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن ایسے حالات میں کسی مسئلے کی حقیقت کا انکار کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خود اپنا عجز تسلیم کر لیں۔

بلاشبہ چوتھے معنیٰ میں ولایت کا مسئلہ عرفانی مسائل میں سے ہے۔ لیکن اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ اسے محض عرفانی مسئلہ ہونے کی بنا پر رد کر دیا جائے۔ گو یہ مسئلہ ایک عرفانی مسئلہ ہے لیکن تشیع کے نقطہ نگاہ سے یہ ایک اسلامی مسئلہ بھی ہے۔ اگرچہ تشیّع ایک مذہب ہے اور عرفان ایک مسلک ہے۔ تاہم یہ مذہب اور وہ مسلک (ان خرافات سے قطع نظر جو اس سے وابستہ کر دی گئی ہیں) اس نقطے پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ پھر اگر یہ باور کرنا ضروری ہو کہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے یہ نظریہ دوسرے سے مستعار لیا ہے تو تمام تاریخی شواہد اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ عرفان نے یہ نظریہ تشیّع سے حاصل کیا ہے۔ یہاں ہم مختصراً اس رائے کی بنیاد کا ذکر کرینگے۔

اِس سلسلے میں جو سب سے اہم مسئلہ قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کیا چیز ہے؟ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسلام اور دوسرے تمام آسمانی مذاہب کے دینی اعمال کا انتہائی مقصد قربِ الٰہی کا حصول ہی ہے۔

قربِ خداوندی سے کیا مراد ہے؟

بعض اوقات روزمرّہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ کے عام مفہوم سے واقفیت ہمارے لیے گمراہ کن ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس طرح اسلامی علوم میں استعمال ہونے والے بہت سے الفاظ اپنے اصلی معنیٰ کی بجائے عمومی معنوں میں ڈھل جاتے ہیں۔

ہم اکثر قرب، نزدیکی، قریب اور نزدیک کے الفاظ ان کے اصلی معنوں یعنی "جسمانی نزدیکی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: "اُس پہاڑی کے نزدیک ایک چشمہ ہے" یا یہ کہ "میں اس پہاڑی کے قریب گیا" ایسے جملوں سے ہماری مراد حقیقی نزدیکی اور باہمی فاصلے میں کمی ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "فلاں شخص فلاں دوسرے شخص کے دل کے بہت قریب ہے" تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ مقدم الذکر شخص مؤخر الذکر کا منظورِ نظر ہے۔ یہاں لفظ "قریب" مجازی طور پر استعمال کیا گیا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے، یہاں جسمانی فاصلے کا کوئی سوال نہیں بلکہ اُنس اور محبّت کو "قُرب" کا نام دیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے قرب یا نزدیکی کی ماہیت کیا ہے ؟ کیا لوگ اللہ کے احکام کی پیروی اور اس کی عبادت کر کے اس کی جانب بڑھتے ہیں اور اس کے قریب ہوجاتے ہیں ؟ کیا ان کے اور اللہ کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہوتا جاتا ہے اور بالآخر ختم ہوجاتا ہے اور قرآن مجید کے الفاظ لِقَاءِ رَبِّ (وہ اپنے پروردگار سے ملتے ہیں) اگر یہ الفاظ مجازی ہیں تو اللہ کے قریب ہونے کے کیا معنیٰ ہیں ؟ ظاہر ہے کہ اللہ کی نسبت سے فاصلے کے کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ وہ نہ قریب ہے نہ دُور ہے۔

اللہ کے قریب ہونے کے معنیٰ اس کی خُوشنودی حاصل کرنے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے خُوش ہوتا ہے اور اسے اپنی عنایتوں سے نوازتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "اللہ تعالیٰ کی خُوشنودی" کے کیا معنیٰ ہیں ؟ خدائے عزّوجلّ کی بزرگ و برتر ذات چُونکہ محلِ حوادث نہیں، لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی شخص سے خفا ہو اور پھر اس سے راضی ہوجائے یا یہ کہ وہ کسی سے راضی ہو اور پھر ناراض ہوجائے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ "خُوشنودی" کا لفظ بھی مجازی ہے۔ خُوشنودی سے مراد اللہ کی وہ رحمت اور مہربانی ہے جو ان لوگوں پر نازل کی جاتی ہے جو اس کے احکام مانتے ہیں، اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اور مہربانی کی نوعیت کیا ہے؟

اس نکتے پر آراء میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق رحمت میں "مادی عنایات" مثلاً جنّت کے باغات، محلّات، حوریں اور "معنوی عنایات" مثلاً علم اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی سبھی شامل ہیں۔ بعض دوسرے لوگ معنوی عنایات کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کو فقط جنت کے باغوں محلّوں اور حوروں کی بدولت حاصل شدہ جسمانی راحت تک محدود سمجھتے ہیں۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قربِ الٰہی کے معنیٰ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں کہ جس شخص پر اللہ کی رحمت سوا ہوتی ہے، اسے جنت میں دوسروں سے زیادہ جسمانی راحت نصیب ہوتی ہے۔

اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ جو لوگ قربِ حقیقی کے منکر ہیں ان کے مطابق عبادت اور اطاعت نہ تو بندے کے ساتھ اللہ کے تعلّق میں کوئی تبدیلی لاسکتی ہیں[1] اور نہ ہی اللہ کے ساتھ بندے کے تعلّق میں کوئی تغیّر لاتی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق حقیقی نزدیکی اور دُوری کے لحاظ سے عالمِ انسانیت کی بزرگ ترین ہستی یعنی حضرت محمدؐ یا شقی ترین انسان مثلاً فرعون اور ابوجہل ایک ہی سطح پر ہیں۔

درحقیقت یہ غلط فہمی اللہ تعالیٰ اور انسان ـــــ بالخصوص

---

[1] قربِ حقیقی کے مؤیدین بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

انسان کے بارے میں ایک مادی طرزِ فکر سے پیدا ہوئی ہے۔ جو شخص انسان اور اس کی رُوح کو فقط پانی اور مٹی کا تودہ سمجھے، اور اس کی اصل یعنی

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ.

تو جب میں اس کو ہر طرح سے درست کرکے اس میں

اپنی روح پھونک دوں۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۲۹)

کا اعتراف نہ کرے اور اسے بھی مجازی معنیٰ پہنائے تو پھر اس کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ قربِ حقیقی کا انکار کر دے۔

لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم انسان کو اس قدر حقیر سمجھیں کہ ہر چیز کی تاویل اور توجیہ کرنے پر مجبور ہو جائیں ؟ اللہ تعالیٰ کمالِ مطلق اور لامحدود ہے، اس کے ساتھ ساتھ وجود کی حقیقت بھی کمال ہے اور ہر قسم کا کمال مثلاً علم، قدرت، حیات، ارادہ، رحمت اور خیر وغیرہ وجود کی طرف لوٹتا ہے کہ جو اصل حقیقت ہے۔

اللہ محض وجود اور کمال ہے اور تمام موجودات اپنے وجود اور کمال کی شدت اور قوت کی نسبت سے اس کے قریب ہیں۔ قدرتی طور پر جمادات اور نباتات کے مقابلے میں فرشتے اللہ کے زیادہ قریب ہیں۔ فرشتوں میں بھی کچھ ایسے ہیں جو دوسروں کے مقابلے میں اس کے زیادہ قریب ہیں اور اسی بنا پر وہ ان دوسروں کو حکم دیتے ہیں اور ان پر تسلط رکھتے ہیں۔ قربِ خداوندی کے معاملے میں ان کے مابین اس فرق کا تعلق ان کی تخلیق میں اختلاف

کی بنا پر ہے۔ اصطلاحاً اسے "قوسِ نزول" کا فرق کہا جاسکتا ہے۔

آیۂ مبارکہ :

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ۔

ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (سورہ بقرہ - آیت ۱۵۶)

کے مطابق تمام موجودات اور بالخصوص انسان کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ چونکہ انسان وجود کی ایک اعلیٰ سطح پر ہے اس لیے اس کی واپسی بھی اسی شکل میں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے احکام برضا و رغبت بجالائے۔ نیکی اور اللہ کی فرماں برداری کے راستے پر چلتے ہوتے وہ حیوانی سطح سے بڑھ کر فرشتوں سے بلند تر مقام حاصل کرلیتا ہے، اس کی یہ بلند پروازی اور ترقی نہ تو رسمی اور انتظامی ہے اور نہ ہی اسمبلی کے ایک رکن کی بطورِ وزیر تقرری یا کسی جماعت کے عام رکن کی قائد کے طور پر نامزدگی کی طرح معاہداتی ہے، بلکہ یہ دراصل وجود کے زینے کا طے کرنا ہے اور وجود کا شدّت، قوت اور کمال حاصل کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم، قدرت، حیات، ارادے اور عزم میں اضافہ ہو اور اس کے نفوذ اور تصرّف کا دائرہ وسیع ہو۔

اللہ کے قرب کے معنیٰ یہ ہیں کہ وجود کی حقیقی منزلیں طے کی جائیں اور لامتناہی ہستی کے نزدیک پہنچا جائے۔

یہ ناممکن ہے کہ اپنی فرماں برداری کے نتیجے میں انسان

فرشتوں کے مقام تک نہ پہنچے بلکہ وہ اس سے آگے بھی جا سکتا ہے۔ قرآن مجید انسان کے مقام کی توثیق کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ.

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب کے سب سجدے میں جھک گئے۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۳۴)

پس بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کوئی انسان کے اس مقام اور منزلت سے انکار کرے وہ ابلیس ہے۔

ظاہری اور معنوی زندگی

اپنی ظاہری حیوانی زندگی کے اندر انسان ایک معنوی زندگی بھی رکھتا ہے۔ معنوی زندگی جس کی استعداد ہر شخص میں پوشیدہ ہے اس کے اعمال اور مقاصد کی پختگی اور کمال سے جنم لیتی ہے۔ انسان کی خوش نصیبی اور بدنصیبی اس کی معنوی زندگی سے تعلق رکھتی ہے جس کا انحصار اس کے اعمال، نیتوں اور اس کے پیش نظر مقصد پر ہوتا ہے۔

ہم زیادہ تر اسلامی تعلیمات کے ان پہلوؤں سے واقف ہیں جن کا تعلق اس دنیا کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں حکمت اور فلسفے سے مالا مال ہیں۔ اسلام زندگی

کے مسائل کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور نہ ان کی اہمیت سے انکار کرتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق اس دنیا کی زندگی سے جدا معنویت کا کوئی وجود نہیں۔ جیسا کہ رُوح کے بدن سے جُدا ہو جانے کے بعد اس کا تعلق اس دنیا سے ختم ہو جاتا ہے اور اس کی سرنوشت ایک اور جہان سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اس جہان میں زندگی کو منہا کرنے کے بعد معنویت کے بارے میں گفتگو کرنا ایک لایعنی بات ہے۔

تاہم جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ فقط زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے مخصوص ہے۔ نہیں! یہ بات نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات اللہ کی فرماں برداری اور اس کے قرب کے حصول کے راستے پر گامزن ہونے اور یوں وجود کا کمال حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ انسان ــ جسم، مادّے اور انفرادی و اجتماعی زندگی سے ماوراء ایک باطنی کمال کا سفر کر سکتا ہے۔ اس سفر کا سرچشمہ کئی ایک معنوی مقامات ہیں۔ انسان اپنی عبودیت اور اخلاص کے ساتھ عملاً ان مقامات کی سیر کرتا ہے جو اکثر اسی دنیا میں، ورنہ دوسری دُنیا میں ہوتی ہے جب کہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ ان تمام مقاماتِ قرب کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس نے طے کیے ہوتے ہیں اور قرب کے وہ مقامات اور مراتب "ولایتِ تکوینی" کا

نتیجہ ہوتے ہیں[1]

نبوّت اور ولایت

حضرت استاذنا الاکرم علامہ طباطبائی نے فرمایا ہے:

"اسلامی تعلیمات کا ایک حصّہ اجتماعی ضوابط پر مشتمل ہے جو بظاہر اجتماعی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں، دوسری دنیا کی خوش بختی یا بدبختی یا دینی اصطلاح میں جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کی سزاؤں سے ان ضوابط کا تعلق چند ایسے مظاہر کی وجہ سے ہے جو انسان کے ان ضوابط پر عمل کرنے یا ان کی خلاف ورزی کرنے کے دوران جنم لیتے ہیں اور غیر محسوس طور پر نشوونما پاتے ہیں۔ جب انسان دوسری دنیا میں منتقل ہوجاتا ہے اور ظاہر کا پردہ چاک ہوجاتا ہے تو یہ ذخیرہ منظرِ عام پر آجاتا ہے اور خود انسان پر عیاں ہوجاتا ہے۔

پس مذہبی تعلیمات کے عین مطابق گزاری گئی اجتماعی زندگی کی تہوں کے نیچے ایک زندہ حقیقت یعنی ایک معنوی زندگی وجود رکھتی ہے جو دوسری دنیا کی ابدی سعادت کا سرچشمہ ہے۔ اس حقیقت

---

[1] علامہ سید محمد حسین طباطبائی۔ سالنامہ مکتب تشیع شمارہ ۲ صفحات ۱۷۲ تا ۱۸۰

کو "ولایت" کا نام دیا گیا ہے۔

"نبوّت" ایک ایسی حقیقت ہے جو زندگی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی وصول کرتی ہے اور لوگوں تک پہنچاتی ہے۔ ولایت بھی ایک حقیقت ہے اور یہ نبوّت کی وساطت سے حاصل کیے گئے احکام الٰہی پر عمل کرنے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔

امام بطور حاملِ ولایت

علامہ طباطبائیؒ "ولایت" اور اس کے حامل "امام" کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ دنیا ولایت کے حامل یعنی ایک "انسانِ کامل" سے کبھی خالی نہیں رہی فرماتے ہیں:

"اِس میں شک نہیں کہ وِلایت کا ایک ایسا راستا موجود ہے جس پر گامزن ہونے سے انسان معنوی کمال کے مختلف مراحل طے کرتا ہے اور قربِ الٰہی کے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے، کیونکہ ایک باطنی حقیقت کے بغیر ظاہری دینی پابندیوں کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تخلیقی قوّت یا مآخذ جس نے انسان کے لیے دینی ظواہر یعنی عملی، اخلاق اور اجتماعی ضوابط کا اہتمام کیا ہے اور اسے ان کی جانب دعوت دی ہے، اس نے لازمی طور

سے اس باطنی حقیقت کے لیے بھی اہتمام کیا ہوگا جو دینی ظواہر کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے جو دلائل نبوت کا وجود اور اس کا دوام (یعنی اس کے لائے ہوئے مذہبی احکام کا دوام) ثابت کرتی ہیں وہی امامت کا نظام اور اس کا دوام بھی ثابت کرتی ہیں۔ یہ کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ قوانین و ضوابط تو واقعی موجود ہوں، لیکن باطنی حقیقت کا کوئی وجود نہ ہو یا عالمِ انسانیت کا رابطہ اس سے منقطع ہوجاتے ہے؟ جو شخص اہلِ ولایت کا میرِ کارواں ہو اور انسانیت سے اس حقیقت کا رابطہ برقرار رکھے اسے قرآن مجید اِمام کا نام دیتا ہے:[1]

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔

اور جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ انھوں نے پوری کردیں تو اس نے فرمایا۔ میں تمھیں بنی نوع انسان کا اِمام بنانے والا ہوں۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

اِمام وہ شخص ہے جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ صراطِ ولایت کے پیشوا کے طور پر کرتا ہے اور وہ باطنی

---

[1] تفصیلات کے لیے علامہ طباطبائیؒ کی تفسیر المیزان ملاحظہ فرمائیں۔

ہدایت کی باگ ڈور سنبھالتا ہے۔ وہ ولایت کی اِن شعاعوں کا مرکز ہوتا ہے جو لوگوں کے دلوں کو منوّر کرتی ہیں۔"[1]

اصولِ کافی (باب: اِنَّ الْاَئِمَّةَ نُوْرُاللّٰهِ) کے مطابق ابو خالد کابلی سے روایت ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے مندرجہ ذیل آیتِ قرآنی کے بارے میں سوال کیا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا.

پس اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا۔

(سورۂ تغابن - آیت ۸)

امام علیہ السلام نے اس آیت کے معنوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم، اے ابو خالد! امام کی روشنی مومنین کے دلوں میں سورج کی روشنی کے مقابلے میں زیادہ آب و تاب سے چمکتی ہے۔"

آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بات غلط ہے کہ دینی تعلیمات کا مقصد دنیاوی زندگی میں اچھے نتائج برآمد کرنے تک محدود سمجھا جائے اور قربِ الٰہی (جو اچھے اعمال کا براہِ راست نتیجہ

---

[1] علامہ سیّد محمد حسین طباطبائی۔ مکتبِ تشیّع شمارہ ۲

ہے) کی تاویل ان معنوں میں کی جائے کہ اللہ کی خوشنودی ایک ایسی چیز ہے جیسی خوشنودی دنیا میں برسر اقتدار لوگوں سے حاصل ہوتی ہے ۔ اس قسم کی تاویل اس موثر کردار کو نظرانداز کردیتی ہے جو قربِ الٰہی انسان کی زندگی میں ادا کرتا ہے قربِ الٰہی انسان کو وجود کے زینے سے بلند مقام پر لے جاتا ہے ۔ یہ قدرتی امر ہے کہ جو لوگ قربِ الٰہی کے بلندترین مراحل طے کرتے ہیں اور مرکزِ وجود کے قریب تر ہو جاتے ہیں، وہ دنیا پر باطنی غلبہ حاصل کرلیتے ہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی ارواح اور ضمائر پر قابو پاتے اور ان کے اعمال کے شاہد ہوتے ہیں ۔

بنیادی طور پر ہر وہ موجود جو کمال کے راستے پر گامزن ہوتا ہے قربِ الٰہی کے کچھ مراحل طے کرتا ہے ۔ انسان بھی موجودات میں سے ہے اور اس کا کمال محض اس چیز تک محدود نہیں، جسے آجکل "تمدن" یعنی سائنس اور فن کی مختلف شاخوں اور انفرادی اور اجتماعی طرزِ سلوک کے ان قواعد کی ترقی کہا جاتا ہے جو موجودہ دور میں مفید ہیں ۔ اگر انسان کو اسی سطح پر دیکھا جائے تو یہ بات صحیح ہے لیکن انسان کے لیے ایک اور راستہ بھی ہے جو تہذیبِ نفس اور اللہ سے رابطہ قائم کرلینے سے اس کو اپنے اصلی مقصد تک پہنچاتا ہے ۔

بندگی سے ربوبیت تک

"بندگی سے خدائی تک" کے تصوّر سے ذہن کو ایک دھچکا

لگتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بندہ، بندگی کی حدود سے نکل کر خدائی کی حدود میں قدم رکھے؟ این التراب و ربّ الارباب؟

بقول محمود شبستری ؎

سیہ روئی ز ممکن در دو عالم
جدا ہرگز نشد واللہ اعلم

ممکن الوجود سے دونوں جہان میں روسیاہی
ہرگز جدا نہیں ہو سکتی اور اللہ ہی بہتر
جاننے والا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے، لیکن "ربوبیت" سے مراد خدائی نہیں بلکہ آقائی ہے۔ ہر وہ شخص جو قدرت رکھتا ہے اس چیز کا آقا ہے جس پر اسے اختیار اور تصرّف حاصل ہو۔ جناب عبدالمطلب نے ابرہہ سے جو خانہ کعبہ گرانے آیا تھا فرمایا تھا:

"اِنِّیْ رَبُّ الْاِبِلِ وَاِنَّ لِلْبَیْتِ رَبًّا.
میں اونٹوں کا مالک ہوں اور ان کا مطالبہ
کرنے آیا ہوں۔ جہاں تک اس گھر کا تعلق ہے
اس کا خود ایک مالک ہے۔"

ہم نے یہ معنیٰ ایک مشہور حدیث کی پیروی کرتے ہوئے اخذ کیے ہیں جو مصباح الشریعۃ میں نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ

"اَلْعُبُوْدِیَّۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبُوْبِیَّۃُ.
اللہ کی بندگی ایک گوہر ہے جس کی انتہا

آقائی یعنی قدرت اور توانائی ہے۔"

انسان ہمیشہ اس کوشش میں رہا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت کرے، جس کی بدولت اپنے آپ پر اور دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

بالفعل ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے کون سے طریقے اختیار کیے اور آیا اسے کامیابی ہوئی یا نہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک اور نادر طریقہ بھی ہے۔ جب انسان وہ طریقہ اپناتا ہے تو اس کا مقصد طاقت حاصل کرنا اور دنیا پر غلبہ پانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس انکسار اور اپنے آپ کو فنا کر دینا ہوتا ہے۔ یہ نادر طریقہ بندگی کا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی متابعت اختیار کرتا ہے وہ ہر چیز پا لیتا ہے، گو وہ کسی بھی چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

ابوسعید ابوالخیرؒ نے اس بارے میں کیا خوب کہا ہے[۵]:

آن کس کہ ترا شناخت جان را چہ کند؟
فرزند و عیال و خانمان را چہ کند؟
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہان را چہ کند؟

"اے اللہ! جس نے تیری معرفت حاصل کر لی ہو اس کی نظر میں جان و مال اور زن و فرزند کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

تو نے اسے اپنا دیوانہ بنالیا اور پھر دوجہان
اس کو بخش رہا ہے۔ بھلا تیرا دیوانہ دوجہان کو
لے کر کیا کرے گا ؟ اسے تو صرف تجھ ہی سے
غرض ہے۔

مراحل ومنازل

انسان کی بندگی ، اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی فرمانبرداری سے جو ولایت ، کمال اور قدرت حاصل ہوتی ہے ، اس کے کئی مراحل ہیں :

☼ پہلا مرحلہ بے حد روحانی تاثیر کا حامل ہے۔ اس مرحلے پر انسان اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ؛ جب اللہ تعالیٰ انسان کے نیک اعمال کو قبول فرماتا ہے تو اس کا کم سے کم اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک ایسی بصیرت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا .

اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ایک مایۂ تمیز پیدا کردے گا۔

(سورۂ انفال - آیت ۲۹)

پھر فرماتا ہے :

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.

جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں
ہم انھیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔

(سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹)

یوں انسان اپنے نفس اور حیوانی خواہشات پر قابو پالیتا ہے اور خود اپنا آقا بن جاتا ہے۔ قرآن مجید نماز کے بارے میں فرماتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ.

بلاشبہ نماز انسان کو ناپسندیدہ اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۴۵)

روزے کے بارے میں فرماتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.

تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلی امتوں پر فرض تھے تاکہ تم ان کے ذریعے تقویٰ اختیار کرو اور اپنے اندر گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا کرو۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۳)

پھر ان دونوں عبادات کے متعلق فرماتا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ

وَالصَّلٰوۃِ ۔

اے ایمان والو! نماز اور صبر (روزے) سے مدد حاصل کرو۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۱۵۳)

اللہ کی بندگی کے اس مرحلے پر جو چیز انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاص بصیرت کی بدولت وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، بندگی کا پہلا نتیجہ نفسِ امّارہ پر ربوبیت اور ولایت حاصل کرنا ہے[1]

☼ دوسرا مرحلہ قوّتِ متخیلہ یعنی پراگندہ خیالات پر قابو پانا ہے۔ ہماری قوتوں میں سے قوتِ متخیلہ سب سے زیادہ عجیب ہے اس قوت کی وجہ سے ہمارا دماغ ہر لحظہ ہماری توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل کرتا رہتا ہے۔ یہ قوّت ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ ہم اس کے اختیار میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خواہ کتنا بھی چاہیں اپنی توجہ ایک مخصوص چیز پر مرکوز نہیں رکھ سکتے۔ مثلاً اپنی تمام کوششوں کے باوجود ہم نماز کے دوران اپنے دل کو یکسو نہیں رکھ سکتے۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ طالبِ علم (دل) نماز میں حاضر رہے۔ لیکن کبھی جو ہم ادھر متوجہ ہوتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ "دل" نماز سے الگ اپنی ہی سوچوں میں پڑا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے اس حقیقت کے بارے میں بڑی دل آویز

---

[1] تقویٰ کی تشریح کے لیے مصنف کی کتاب ستیّ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی ملاحظہ ہو۔

مثال دی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

"مَثَلُ الْقَلْبِ مَثَلُ رِيْشَةٍ فِي الْفَلَاةِ تَعَلَّقَتْ فِي اَصْلِ شَجَرَةٍ يُقَلِّبُهَا الرِّيْحُ ظَهْرًا الْبَطْنِ. [1]

دل کی مثال اس پر کی طرح ہے جو بیابان میں ایک درخت کی شاخ سے لٹکا ہوا ہے، جدھر کی ہوا آتی ہے وہ اس کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر حرکت دیتی رہتی ہے۔"

مولانا روم نے اس حدیث کو یوں نظم کیا ہے ؎

گفت پیغمبر کہ دل ہمچون پری است
در بیابانی اسیر صرصری است
باد پر را ہر طرف راند گزاف
گہ چپ و گہ راست باصد اختلاف

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے :

"لَقَلْبُ ابْنِ اٰدَمَ اَشَدُّ انْقِلَابًا مِنَ الْقِدْرِ اِذَا اجْتَمَعَتْ غَلْيًا. [2]

انسان کے دل میں ایک اُبلتی ہوئی دیگ سے بھی زیادہ ہیجان ہوتا ہے۔"

---

[1] نہج الفصاحۃ وجامع صغیر جلد ۱ صفحہ ۱۰۲۔
[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۔

اس حدیث کو مولانا رومؒ یوں بیان کرتے ہیں ؎

درحدیث دیگر آن دل را چنان
کاب جوشان ز آتش اندر غازقان
ہرزمان دل را دگر رائی بود
آن نہ از وی بلکہ از جائی بود

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اپنے خیالات کا محکوم رہے، اور یہ پُراسرار قوت جو ایک پرندے کی طرح ایک شاخ سے دوسری شاخ کی جانب اڑتی پھرتی ہے اس کے وجود پر مکمل طور پر مسلّط ہو۔ یا یہ کہ قوّتِ متخیلہ کا محکوم ہونا انسان کے خام اور ادھورے ہونے کی بنا پر ہے اور جن لوگوں کی روحانیت مکمل طور پر نشوونما پا چکی ہو وہ اس بات پر قادر ہوتے ہیں کہ اس خودسر قوت یعنی قوتِ متخیلہ کو اپنے قابو میں لے آئیں۔

اِس میں یہ دوسری شق ہی درست ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کی پرواز کو قابو میں لے آئے، ورنہ یہ شیطانی قوت اس کی ہر استعداد کو تباہ و برباد کردے گی اور اسے قربِ الٰہی کے راستے پر گامزن نہیں ہونے دے گی اور اس میں موجود تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو ضائع کردے گی۔

معروف صوفی شاعر مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

جان ہمہ روزہ لگد کوب از خیال
وز زیان و سود و از خوفِ زوال،

نی صفا می ماندش نی لطف و فر

نی به سوی آسمان راه سفر

"اگر انسان ہر وقت اپنے آرام اور تکلیف اور نفع اور نقصان کے خیالات میں غرق رہے تو وہ سکونِ قلب کھو دیتا ہے اور عالمِ بالا میں پرواز کے قابل نہیں رہتا۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ۔

ہماری آنکھیں سوتی ہیں لیکن ہمارا دل جاگتا رہتا ہے۔"

اِس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مولانا روم نے کہا ہے کہ آنحضرتؐ کا دل ہر وقت جاگتا رہتا تھا کیونکہ انھیں اپنے خیالات پر قابو حاصل تھا، وہ اپنے خیالات کو ہمیشہ زیرِ تسلط رکھتے تھے اور کبھی ان سے مغلوب نہیں ہوتے تھے۔

اِس دوسرے مرحلے پر جو لوگ اللہ کی بندگی کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ قوتِ متخیلہ کو قابو میں لا کر وہ کسی مزاحمت اور رکاوٹ کے بغیر آزادی سے بلندیوں کی جانب پرواز کر سکتے ہیں۔

امام علی ابن ابی طالب اور امام علی ابن حسین علیہم السلام نماز میں اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ ایک تیر جو امام علی ابن ابی طالبؑ کے پاؤں میں پیوست ہو گیا تھا اس وقت کھینچ کر نکال

لیا گیا جب وہ نماز ادا کر رہے تھے، لیکن انھیں اس چیز کا مطلقاً احساس نہیں ہوا۔ اسی طرح کی صورت اس وقت پیدا ہوئی، جب امام علی زین العابدین علیہ السلام کا کمسن بچّہ ایک بلند جگہ سے نیچے گر پڑا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ گھر میں کافی چیخ پکار مچی لیکن امام علیہ السلام کو جو اس وقت نماز ادا کر رہے تھے، خبر تک نہ ہوئی۔ ایک ہڈی جوڑنے والے کو بلایا گیا اور اس نے بچے کی ہڈی درست کر کے پٹی باندھ دی۔ جب نماز سے فارغ ہونے کے بعد امام زین العابدینؑ کی نگاہ بچے کے ہاتھ پر پڑی تو انھیں بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے اس کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ نماز میں اس قدر محو تھے کہ گھر میں جو چیخ پکار مچی اور بھاگ دوڑ ہوئی اس کا آپ کو علم نہ ہوا۔

ان بزرگوار ہستیوں کی تو خیر بات ہی الگ ہے، ہم نے ان کے پیروؤں میں بھی ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو نماز پڑھتے ہوئے اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ انھیں کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ ہمارے استاد بزرگوار حاج میرزا علی آقا شیرازی اصفہانی اَعلَی اللّٰہُ مَقامَہٗ ایسے ہی اشخاص میں سے تھے۔

یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوئی چیز اتنی موثر نہیں جتنی وہ عبادت ہے جس کی بنیاد اللہ کی جانب توجّہ پر ہو۔ لیکن ریاضت کش لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں اور عموماً ترکِ دنیا یا بدن کو اذیت دے کر بہت معمولی حد تک یہ مقصد حاصل کرتے

ہیں۔ تاہم اسلام ایسے ناپسندیدہ مشاغل کی ضرورت محسوس کیے بغیر عبادت کے ذریعے مطلوبہ مقصد حاصل کرتا ہے۔

جب اللہ کی جانب کامل توجہ کی جائے اور یہ یاد رکھا جائے کہ انسان آقاؤں کے آقا اور خالق و مالک کے سامنے کھڑا ہے تو جمعیتِ خاطر کی راہ ہموار ہو جاتی ہے اور ذہن میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے ؎

زلف آشفتہ او باعثِ جمعیت ما است
چون چنین است پس آشفتہ ترش باید کرد

ناانصافی ہوگی اگر ہم یہاں شیخِ فلاسفۂ اسلام بوعلی سینا کے قول سے تائید حاصل نہ کریں۔ یہ نابغۂ دہر، اس عام عبادت کا ذکر کرنے کے بعد جو فقط اجر کی خاطر کی جاتی ہے اور جس کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں، یقین و معرفت سے وابستہ عبادت کے متعلق کہتا ہے:

وَالْعِبَادَةُ عِنْدَ الْعَارِفِ رِيَاضَةٌ مَا لِهِمَمِهٖ وَقُوَا نَفْسِهِ الْمُتَوَهِّمَةِ وَالْمُتَخَيِّلَةِ لِيَجُرَّهَا بِالتَّعْوِيْدِ عَنْ جَنَابِ الْغُرُوْرِ اِلٰى جَنَابِ الْحَقِّ فَتَصِيْرُ مُسَالِمَةً لِّلسِّرِّ الْبَاطِنِ حِيْنَ مَا يَسْتَجْلِى الْحَقُّ لَا تُنَازِعُهٗ فَيَخْلُصُ السِّرُّ اِلَى الشُّرُوْقِ الْبَاطِنِ.

اہلِ معرفت کے نزدیک عبادت تخیّل اور

تصوّر کی قوتوں کا وہ عمل ہے جس کا مقصد ان کی توجّہ مادی چیزوں سے ہٹا کر ملکوتی تصوّرات کی طرف مبذول کرنا ہے۔ چنانچہ مسلسل مشق کے بعد یہ قوتیں انسان کی حق پرستی کی فطرت کے ماتحت ہو جاتی ہیں اور جب انسان کی باطنی رُوح روشنی حاصل کرنا چاہے تو سدّ راہ نہیں ہوتیں۔" ؎۱

☼ تیسرے مرحلے پر رُوح اس قدر قوی ہو جاتی ہے کہ اکثر معاملات میں اسے بدن کی ضرورت نہیں رہتی، حالانکہ بدن کو ہر حالت میں رُوح کی ضرورت ہوتی ہے۔

عام حالات میں روح اور بدن ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ بدن کو اپنی زندگی اور وجود کے لیے رُوح کی ضرورت ہے اور رُوح کے بغیر بدن جلد ہی ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رُوح کو اپنے افعال کے لیے بدن کا سہارا لینا پڑتا ہے اور بدن کے بغیر وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتی۔ روح محض چند استثنائی حالات میں بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ بے نیازی چند لمحوں کے لیے ہوتی ہے اور بعض اوقات دائمی ہوتی ہے، اس صورتِ حال کو "خلع بدن" کہا جاتا ہے۔

معروف اشراقی حکیم شہاب الدین سہروردی نے کہا ہے:

؎۱ بوعلی سینا۔ اشارات۔ باب ۹

"ہم کسی شخص کو اس وقت تک حکیم نہیں سمجھتے جب تک وہ شخص "خلع بدن" نہ کرسکتا ہو۔"

میر داماد نے کہا ہے:

"ہم کسی شخص کو اس وقت تک حکیم نہیں سمجھتے جب تک "خلع بدن" اس کی طبیعت ثانیہ نہ بن گئی ہو اور وہ جب چاہے یہ فعل انجام دے سکتا ہو۔"

تاہم محققین کا کہنا ہے کہ خلع بدن کمال کے کسی اونچے درجے کے حصول کا ثبوت نہیں ہے۔ یعنی عالمِ مثال سے گزرنے اور غیبِ معقول میں قدم رکھنے سے قبل ہی ایک آدمی اس مرحلے تک پہنچ سکتا ہے۔

☼ چوتھا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کا بدن ہر لحاظ سے خود اس کے فرمان اور ارادے کے تابع ہو جائے اور جب بھی وہ چاہے خارق العادت کام انجام دے۔ بہر حال اس نکتے پر طویل بحث کی ضرورت ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"مَا ضَعُفَ بَدَنٌ عَمَّا قَوِيَتْ عَلَيْهِ النِّيَّةُ."

ارادہ جو کچھ کرنا چاہے بدن اسے انجام دینے میں ناتوانی کا اظہار نہیں کرتا۔

☼ پانچواں مرحلہ بلند ترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر یہ کائنات

بھی انسان کے ارادے کے تابع ہو جاتی ہے اور اس کے احکام مانتی ہے۔ انبیائے کرامؑ اور اولیائے حق نے جو معجزے اور کرامات دکھائی ہیں وہ اسی زمرے میں آتی ہیں۔

گو معجزات کا مسئلہ مفصل بحث کا متقاضی ہے لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص کسی آسمانی مذہب پر ایمان رکھتا ہو وہ ان سے انکار نہیں کر سکتا، مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص مسلمان ہو اور قرآن پر ایمان اور اعتقاد رکھتا ہو، لیکن معجزات کا منکر ہو۔

اسلامی زاویۂ نگاہ سے معجزات کا مسئلہ ایک حل شدہ مسئلہ ہے۔[1] ہم یہاں اِس مسئلے کے بارے میں ولایتِ تصرّف کے نقطۂ نظر سے بحث کریں گے۔ قدرتی طور پر ہمارا روئے سخن ان لوگوں کی جانب ہے جو قرآن مجید پر ایمان اور اعتقاد رکھتے ہیں اور معجزات کے وقوع پذیر ہونے کے قائل ہیں۔ ہم یہاں جس نکتے پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ معجزہ فقط ولایتِ تصرّف اور ولایتِ تکوینی کا مظہر ہے۔ قرآن مجید معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ رسولؐ کا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے اور اس لیے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک نبی یا ولی معجزہ دکھاتا ہے کیونکہ اسے اللہ کی جانب سے ایک خاص قوّت عطا

---

[1] ملاحظہ ہو آیت اللہ العظمیٰ آقائے خوئی کی کتاب فلسفۂ معجزہ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی کراچی

کی جاتی ہے، وہ کائنات میں جو جی چاہے کرتا ہے، لیکن یہ سب کچھ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے۔ مثلاً

- وہ ایک عصا کو اژدہا میں تبدیل کرسکتا ہے،
- مادرزاد نابیناؤں کو آنکھوں کی روشنی دے سکتا ہے،
- حتّیٰ کہ مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے۔

اسے یہ غیر معمولی قوت قربِ الٰہی کی راہ پر چلنے اور مرکزِ ہستی کے قریب تر ہونے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معجزہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی جانب سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور انبیاء اور اولیاء کا اس میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ قوانین فطرت میں کوئی تبدیلی لانا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق معجزے میں انبیاء اور اولیاء کا کردار محض نمائشی اور برائے نام ہوتا ہے۔

تاہم یہ خیال درست نہیں، نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کی بلندی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ایک طبیعی فعل بلاواسطہ اور اس کے قائم کردہ نظام کے خلاف اس سے ظاہر ہو بلکہ یہ تصوّر قرآن مجید کے مندرجات کے بھی خلاف ہے، قرآن مجید نے واضح الفاظ میں معجزہ دکھانے کا کام انبیائے کرامؑ سے منسوب کیا ہے، لیکن بلاشبہ وہ یہ معجزے اللہ کے اذن اور اجازت سے دکھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کی نوعیت انسانی اذن جیسی نہیں ہے کہ الفاظ یا اشاروں کے ذریعے کوئی اخلاقی یا سماجی پابندی ختم کردی جائے۔ اللہ کے اذن سے مراد اس کمال کا

عطا کیا جاتا ہے جو ایک مافوق الفطرت قوّت پیدا کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ نہ چاہے کہ معجزہ وقوع پذیر ہو تو وہ اس قوت کو زائل کرسکتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ.

کسی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی آیت (معجزہ) دکھائے۔

(سورۂ مؤمن۔ آیت ۷۸)

اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ معجزات انبیائے کرامؑ ہی دکھاتے ہیں۔ "اللہ کے اِذن کے ساتھ" کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ یہ مغالطہ پیدا نہ ہو کہ یہ مافوق الفطرت کام انجام دینے میں انبیائے کرامؑ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں آزاد ہیں۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کو کوئی طاقت یا قدرت حاصل نہیں، ہر طاقت اور قوت خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، چھوٹی ہو یا بڑی، ذاتِ خداوندی کا سہارا لیتی ہے۔ ہر موجود خواہ وہ کسی مرتبے پر ہو اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کی گزرگاہ اور اس کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ پیغمبر معجزوں سمیت اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اور ہمیشہ اسی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

سورۂ نمل میں قرآن نے حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی دعوت پر ملکہ سبا ان سے ملنے

کے لیے روانہ ہوئی۔ حضرت سلیمانؑ یہ چاہتے تھے کہ ملکہ کا تخت اس کی آمد سے پہلے آپ کے پاس لایا جائے۔ کچھ درباریوں نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں، جنھیں حضرت سلیمانؑ نے رد کردیا۔ بالآخر

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ
اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ

"وہ شخص جس کے پاس لوحِ محفوظ کا کچھ علم تھا کہنے لگا: میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے تخت آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں۔"

(سورۂ نمل۔ آیت ۴۰)

تب اس نے تخت لاکر پیش کردیا۔

ارشادِ قرآنی کے مطابق جس شخص کے پاس لوح محفوظ کا قدرے علم تھا اس نے کہا کہ میں اتنی قلیل مدّت میں تخت لے آؤں گا۔ پس اس نے قدرت اور قابلیت کو خود اپنے آپ سے منسوب کیا۔

ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ شخص لوحِ محفوظ کا کچھ علم رکھتا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے وہ مافوق الفطرت کام ایک خاص علم کی بدولت انجام دیا۔ یہ وہ علم ہے جس سے بنی نوع انسان ابھی تک ناواقف ہیں، اسے لوح محفوظ سے ارتباط یعنی قربِ الٰہی کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پھر قرآن مجید خود حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ . وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ . وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ . هَٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ .

"ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق دھیمے دھیمے چلتی تھی اور اس کے علاوہ جتنے شیطان عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے تھے سب کو ان کے تابع کر دیا اور ان کے علاوہ دوسرے دیوؤں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوتے تھے۔ (اے سلیمانؑ) یہ ہماری بے حساب عطا ہے، پس یہ تم پر ہے کہ اسے لوگوں کو دو یا اپنے پاس رکھو۔"

(سورہ ص ۔ آیات ۳۶ تا ۳۹)

جو آیات حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، وہ بھی اسی نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں لیکن ہم نے طوالت سے بچنے کی خاطر انھیں نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

جو چیز ہم بالتاکید کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہو، وہ "ولایتِ تصرّف" سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص اس حقیقت کو سائنسی اور فلسفیانہ معیارات پر پرکھنا چاہے تو یہ قطعاً الگ چیز ہے اور ہمارے موجودہ

موضوع سے خارج ہے۔ فی الحال ہم اس مسئلے پر قرآنی نقطہ نگاہ سے ہی غور کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں ہم ایک اور نکتے پر زور دینا چاہتے ہیں کہ جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا تھا۔ ولایت کے وہ تمام مراحل جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے "قربِ الٰہی" کا نتیجہ ہیں، یہ کوئی تمثیلی اور مجازی اسلوبِ بیان نہیں، بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے۔

مشہور و معروف "حدیثِ قدسی" جسے سُنّی اور شیعہ دونوں نے روایت کیا ہے، اس میں یہ حقیقت بڑے دلآویز طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسولِ اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدٌ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَاِنَّهٗ لَیَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّافِلَةِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَلِسَانَهُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِهٖ وَیَدَهُ یَبْطِشُ بِهَا۔ اِنْ دَعَانِیْ اَجَبْتُهٗ وَاِنْ سَاَلَنِیْ اَعْطَیْتُهٗ.

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مجھ سے قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ان فرائض کا بجالانا ہے جن کا میں نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے۔ اگر میرا کوئی بندہ نوافل اور مستحبات بھی بجالاتا ہے تو

میں اس سے محبت کرتا ہوں، جب وہ میرا محبوب
بن جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن
سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں
جن سے وہ دیکھتا ہے، اس کی زبان بن جاتا ہوں
جس سے وہ بات کرتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا
ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اگر وہ مجھے پکارتا ہے
تو میں اُسے جواب دیتا ہوں اور اگر مجھ سے کوئی
چیز طلب کرتا ہے تو اُسے دے دیتا ہوں۔ [1]

اس حدیث سے صاف پتا چلتا ہے کہ عبادت انسان کو اللہ کے قریب لے آتی ہے اور جب وہ اس کے قریب ہو جاتا ہے تو وہ اس سے محبّت کرتا ہے اور اسے اپنی عنایات سے نوازتا ہے۔ پھر وہ الٰہی قوّت سے دیکھنے، سُننے اور بولنے لگتا ہے۔ اس کی دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور اس کی خواہشیں پوری کی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے بارے میں اس کا مخصوص نظریہ مذہب تشیع کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے اسلامی مذاہب سے ممیز کرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے اس مذہب کا عقیدہ ہے کہ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے اور دُنیا کبھی ایک کامل انسان یعنی ایسے انسان سے خالی نہیں رہی جس کی

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۳۵۲

تمام صلاحیتیں بروئے کار آچکی ہوں۔ اس کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسان اپنا جائز مقام ایک کامل انسان (یعنی ولی اور پیشوا جسے اللہ نے مقرر کیا ہو) کے زیر ہدایت اللہ کی اطاعت کے راستے پر چل کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر مذہبِ تشیّع کے اولیاء کہتے ہیں کہ

"بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: عَلَی الصَّلٰوةِ وَالزَّکٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالْوِلَایَةِ وَلَمْ یُنَادِ بِشَیْءٍ کَمَا نُوْدِیَ بِالْوِلَایَةِ۔[1]

وہ اساسی امور جو اسلام کی بنیاد قرار پاتے ہیں پانچ ہیں یعنی نماز، زکات، روزہ، حج اور ولایت ۔۔۔ اور اسلام نے کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا "ولایت" پر دیا ہے۔"

---

[1] وسائل الشیعۃ جلد ۱ صفحہ ۴۔

ضمیمہ

اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مذہب تشیع نے دوسرے عقائد کے مقابلے میں ولایت پر کیوں زور دیا ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ہر اسلامی عقیدے کے پیچھے کوئی ظاہری یا باطنی فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ اسی طرح ولایت کا بھی ایک فلسفہ ہے، جس کا لب لباب ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

۱ ـ ایک ولی عالم انسانیت کو اس کے ممکنہ دشمنوں کے بارے میں خبردار کرتا ہے اور انسان میں ظلم کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

۲ ـ ایک ولی انسان کے دل میں جمال خداوندی کے لیے محبّت پیدا کرتا ہے۔

۳ ـ ایک ولی انسان کے دل میں برائی اور گناہ کے لیے نفرت

کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

۴ — ایک ولی واجب العمل احکام، ہدایات اور قوانین کے اصلی مآخذ کی نشاندہی کرتا ہے۔

۵ — ایک ولی مذکورہ بالا نظریاتی قلعے کی ہر قیمت پر حفاظت کرنے کے لیے انسان کو تیار کرتا ہے۔

۶ — ایک ولی انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف جہادِ اکبر کرکے انھیں زیر کرے، احکامِ شریعت کا پرچم بلند رکھے اور ان کی حفاظت کرے۔

۷ — ایک ولی انسان کے دل میں قربِ الٰہی حاصل کرنے اور اللہ کی مخلوق سے محبّت اور مہربانی کا برتاؤ کرنے کا حقیقی جذبہ پیدا کرتا ہے۔

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اس سے واضح طور پر پتا چل جاتا ہے کہ اسلام میں مکتبِ تشیع بالخصوص ولایت پر کیوں زور دیتا ہے اور اس اسلامی عقیدے سے مکمّل وابستگی ہمارے لیے کیوں ضروری قرار دی گئی ہے۔

(ناشر)

وِلائے تصرّفؑ کی وضاحتؑ

از
فتح اللہ امیدی

مأخوذ
از کتاب خلافت و ولایت شمارہ ۵
مطبوعۂ حُسینیہ ارشاد۔ تہران

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولائے تصرّف کی وضاحت

اِس گفتگو میں زیرِ بحث موضوع ، ولایت کے چوتھے معنیٰ ہیں یعنی وہ ولایت جو عرفان اور فلسفے کی زبان میں "ولایتِ تکوینی" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بنیاد عِلم اور عرفان پر ہے۔

ولایتِ تکوینی انسان کے کمال کی جانب سفر کا نتیجہ ہے، جس کا سرچشمہ روحانی اور معنوی مقامات کا ایک سلسلہ ہے۔ انسان اپنے اندر ہی اندر ان مقامات کی سیر کرتا ہے اور پردے اُٹھ جانے کے بعد اسی دنیا میں یا موت کے بعد ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔

یہ قرب کے وہ درجے اور ولایت کے وہ مقامات ہیں ، جن کی حقیقت ، کمال اور حسن کو سمجھنا عام عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ راستا ہے جو ایمان کی پہلی منزل سے شروع ہوتا ہے

اور حق تعالیٰ کے قرب کے مقام تک چلا جاتا ہے۔

یہ راستا کوئی تصوری اور خیالی راستا نہیں کہ جسے رسمی طور پر راستے کا نام دے دیا گیا ہو، بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے جو انسان کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ صحیح اعتقاد اور نیک اعمال کے وسیلے سے —— مرتبوں میں فرق کے ساتھ —— انسان کی رہنمائی اپنی جانب کرتا ہے اور وہی خدا اور خلق کے درمیان واسطہ ہے جو انسان کی رہنمائی کرکے اسے خُدا کے نزدیک کرتا ہے۔

یہ حقیقت زوال پذیر نہیں ہوتی اور افراد انسانی کے درمیان ہمیشہ زندہ و موجود رہتی ہے۔ یہ ان کی رہنمائی کے لیے استوار ہے اور ہر زمانے میں ولایت کی حقیقت کی حامل رہی ہے اور رہے گی۔ جس طرح جہانِ ہستی مادّی دنیا کی چار دیواری تک محدود نہیں، اور مادی دنیا کو خود ایک اور دنیا نے جنم دیا ہے جو اس دنیا کا باطن اور درحقیقت جہانِ ہستی کی اصلیت ہے، اسی طرح انسان کی انسانیت بھی جسم پر منحصر نہیں، بلکہ اس کا ایک باطن اور ایک روح ہے جس نے انسانیت کی حقیقت کو شکل وصورت بخشی ہے اور جسم کی حیثیت محض اس کی سواری کی ہے۔

جسم اور روح کی باہمی تاثیر

اب ہمارا موضوعِ بحث روح کے وجود کا ثابت کرنا نہیں،

بلکہ کہنا یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔
جس طرح روح جسم پر اثر انداز ہوتی ہے اور خوف کے موقع پر چہرے کا رنگ زرد پڑجاتا ہے اور شرمندگی کے وقت کالا پڑجاتا ہے، اسی طرح جسم بھی روح پر اثر ڈالتا ہے اور کسی کام کے مسلسل کرتے رہنے سے روح میں فطرتِ ثانیہ یعنی مستقل اور ناقابلِ تسخیر صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔

سادہ لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر اچھا یا بُرا عمل انسان کے اندر ایک حقیقت کو وجود میں لاتا ہے جو انسان کی آئندہ زندگی کی تشکیل کرتی ہے۔

جن شرعی احکام پر انسان کو عمل کرنا چاہیے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے اس کے قرب اور ولایت کا راستہ طے کرنے پر جو اثر پڑتا ہے، اس کے لحاظ سے انسان بعینہ ایک زیرِ تربیت بچے کی مانند ہے۔ وہ احکام جو وہ استاد سے "کرو" اور "نہ کرو" کے الفاظ کی شکل میں سُنتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو کام انجام دیتا ہے، وہ ان کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ لیکن جب وہ بڑا ہوجاتا ہے اور اپنی تربیت کا دور مکمل کرلیتا ہے تو ان گرانبہا رُوحانی خصوصیتوں کی بدولت جو وہ اپنے اندر پیدا کرلیتا ہے، معاشرے میں خوش بختانہ زندگی گزارتا ہے۔ اگر اپنے شفیق استاد کے احکام پر عمل کرنے سے سرتابی کرتا ہے تو بجز بدبختی کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یا پھر اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص طبیب کی ہدایات کے مطابق دوائی اور پرہیزی غذا کھاتا ہے اور

مخصوص ورزش کرتا ہے۔ اس وقت وہ بجز ہدایات حاصل کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے کسی چیز سے سروکار نہیں رکھتا۔ لیکن طبیب کی ہدایات پر عمل کرنے سے اس کے بدن میں ایسا اعتدال پیدا ہوجاتا ہے، جس کی بدولت اسے تندرستی، ہر قسم کی خوشی اور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

انسان اس ظاہری زندگی کے اندر ایک باطنی زندگی بھی رکھتا ہے جو اس کے اعمال سے جنم لیتی ہے اور نشو و نما پاتی ہے۔ اس کا کمال اور خوش بختی اور گراوٹ اور بدبختی مکمل طور پر اپنے ان اعمال ہی سے وابستہ ہوتی ہے۔[1]

تمام آسمانی شریعتوں اور انسانی مذاہب میں "عبادت" کے نام سے کچھ اعمال بجا لانے کا حکم دے کر انھیں واجب قرار دیا گیا ہے۔ ان عبادات کا بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ انھیں بجالانے سے انسان خودبخود اپنے معبود کی عنایت اور توجہ کا مورد بن جائے، بلکہ یہ سب انسان کی پیش رفت اور ارتقا کا وسیلہ ہیں ـــ وہ ارتقا جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کی جانب متوجہ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یعنی یہ عبادات انسان کو معنی اور حقیقت کی دنیا کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور مادے اور مادیات کی طرف سے اس کی توجہ ہٹاتی ہیں۔ گویا ان جسمانی

---

[1] ملاحظہ فرمائیے کتاب "پاسدارانِ اسلام" مؤلفہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی مطبوعہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان۔

اور رُوحانی مشقوں کی بدولت اس کا وجود کامل ہوتا ہے اور اس کی ہستی کا دائرہ پھیلتا ہے۔

ہر موجود کی ترقی کا راستہ قُربِ الٰہی

بنیادی طور پر ہر موجود جو کمال کے راستے میں قدم بڑھاتا ہے اور کمال کے مرحلے پر پہنچتا ہے، وہ خدا کے قرب کا راستہ طے کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کا وجود ایک لامحدود وجود اور ایک بے انتہا کمال ہے، اس کا نہ کوئی اندازہ ہے اور نہ ہی کوئی حد ہے۔ اس کے مقابلے میں سب سے زیادہ کمزور موجودات مادی دُنیا کا اولین مواد ہے۔ یہ وہ مواد ہے جس کی بجائے خود کوئی شکل اور صورت نہیں اور یہ نئی شکلیں اور صورتیں قبول کرتا ہے۔ یہ شکلیں اور صورتیں ہی ہیں جو اسے قدر و قیمت بخشتی ہیں کیونکہ ان شکلوں کے عقب میں ہم نئے نئے اثرات دیکھتے ہیں اور یہ بجائے خود ان کے کمال کی جانب سفر کی دلیل ہے۔

انسان بھی دنیا کے موجودات میں سے ایک موجود ہے اور ارتقار سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے کمال کا راستہ نفس کی تہذیب اور ریاضت ہے۔ عبادت جو کہ خدا کی بارگاہ میں پرستش اور روبسجدہ ہونے کا نام ہے، وہ بجائے خود سب سے بڑی ریاضت، تربیت کا بہترین وسیلہ اور کمال کی جانب حقیقی رہنما ہے۔ قرآن مجید سے پتا چلتا ہے کہ عبادت انسان ہی سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ دُنیا کی تمام موجودات فطری طور پر خدا کی پرستش

کرتی اور اس کی تسبیح پڑھتی ہیں۔ خدا کی ایک صفت ان کی ذات کے اندر جلوہ گر ہوتی ہے اور یہ جلوہ انھیں تعظیم پر مجبور کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

"یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔

"جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔"

(سورۂ جمعہ - آیت ۱)

(سورۂ تغابن - آیت ۱)

یہ تسبیح اور ثنا ہم نہیں سن سکتے، لیکن قرآن مجید میں رسولِ اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

"اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے پہاڑ، درخت اور حیوانات سب خدا کو ہی سجدہ کرتے ہیں۔" (سورۂ حج - آیت ۱۸)

اور پھر ارشاد ہوا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ

عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں آسمانوں
اور زمین میں ہیں اور جو پرندے صف بستہ ہیں
وہ سب نماز اور اس کی تسبیح کا طریقہ جانتے ہیں۔

(سورۂ نور۔ آیت ۴۱)

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ "کیا تم نہیں دیکھتے؟" اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ کمال حاصل نہیں کہ کائنات کی گہرائیوں پر نظر ڈال سکیں، ہم تو صرف معتقد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ "کیا تم نے نہیں دیکھا؟" اور مخاطب رسولِ اکرمؐ ہیں۔ یہ چیز آنحضرتؐ کے لیے شہود کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اسے دیکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے، سُننے سے نہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارا کام ایمان لانا اور اعتقاد رکھنا ہے۔

"دنیا کے تمام ذرّے پوشیدہ طور پر تم سے
دن رات یہ کہتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں
اور ہوش رکھتے ہیں، لیکن تم ایسے نامحرموں کے
ساتھ ہم گفتگو نہیں کرتے۔ جب تم بے جان چیزوں
کی طرف جاتے ہو تو جمادات کی رُوح سے کیونکر
واقف ہو سکتے ہو۔ بے جان چیزوں کو چھوڑ کر روح
کی دنیا میں جاؤ اور کائنات کے اجزاء کا شور سنو۔
تم جمادات کی تسبیح صاف صاف سُن سکو گے اور
وہ تاویل کا وسوسہ مٹا دے گی۔ چُونکہ تمھاری روح

کو روشنی میسر نہیں اس لیے چیزوں کو سمجھنے کے لیے تم نے تاویلیں کی ہیں۔ ہاں جب تک انسان حس (مادیت) سے آگے نہیں نکلتا وہ غیب کی تصویر سے بیگانہ رہتا ہے۔ (مثنوی مولانا رومؒ)

اِس سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کے تمام موجودات اپنی فطرت اور اپنے باطن میں خدا کو دیکھتے ہیں اور انسان بھی دوسرے موجودات کی طرح اپنی فطرت میں خدا کی تسبیح اور ثنا کرتا ہے اور لازمی طور پر اسے جانتا اور پہچانتا ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ جب ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق خدا کو جانتا اور پہچانتا ہے تو پھر ایک شخص بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو ذاتِ الٰہی کا منکر ہو، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ خدا کے منکر ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ دِل میں خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور بظاہر انکار کرتے ہوں، بلکہ وہ پوری سنجیدگی سے اس کی ہستی سے انکاری ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر خدا کی معرفت فطری چیز ہے تو پھر سوچ بچار یا سیر و سلوک اور تزکیۂ نفس کے ذریعے اس کی معرفت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فطری معرفت اور فکری معرفت میں فرق ہے۔ جو معرفت اور آشنائی سب کو حاصل ہے وہ سرشت اور فطرت کی سطح پر ہے۔ جو معرفت حاصل نہیں اور اسے کوشش اور عمل سے حاصل کیا جاسکتا ہے وہ سوچ بچار کی سطح پر ہے۔ یہی وہ

سطح ہے جس پر اکثر انکار کی نوبت آتی ہے۔ یعنی ان دو سطحوں میں ایک قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بچّہ اپنی فطرت اور سرشت کی بنا پر حقیقت کا متلاشی ہوتا ہے اور چھان بین کرتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد جو چیزیں دیکھتا ہے ان سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ یہ شعور اور یہ حس بچّے میں ایک شعور اور ایک قسم کی واقفیت کی شکل میں موجود ہوتی ہے۔ بالخصوص جب اس کی عمر تقریباً تین سال کی ہو جاتی ہے تو ایک دانش مند کو بچّے کے اندر موجود اس حس کا مکمل طور پر پتا چل جاتا ہے اور وہ اس کے وجود کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن خود بچّے کو اپنے اندر موجود اس شعور کا علم نہیں ہوتا۔ یعنی وہ یہ شعور رکھتا ہے لیکن اس کی موجودگی سے واقف نہیں ہوتا اور اکثر اس کی موجودگی سے انکار کرتا ہے۔ بلکہ خود اپنے وجود کے بارے میں بھی بچّے کی یہی کیفیت ہوتی ہے، یعنی وہ اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے لیکن اس واقفیت سے واقف نہیں ہوتا۔ خدا کی معرفت کی بھی بعینہٖ یہی صورت ہے، یعنی ہر شخص طبعاً اور فطرتاً خُدا کی ذات سے واقف ہوتا ہے لیکن اسے اپنی اس واقفیت کا علم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

دانش ذوات را فطری است

دانش دانش است کآن فکری است

اب ہم دوبارہ اصلی مطلب کی طرف لوٹتے ہیں، اب ہمیں یہ پتا چل گیا ہے کہ عبادت کا نتیجہ خدا کا قرب ہے۔ پس

ضروری ہے کہ انسان جوں جوں بلند درجوں پر پہنچتا جائے، اس کے وجود کے کمالات یعنی علم، قدرت اور ارادہ میں خُدا کی طرف سے اضافہ ہوتا چلا جائے۔

عوالمِ ہستی

جو کمال مادّی دنیا میں موجود ہو مسلّمہ طور پر وہی کمال عالمِ بالا میں زیادہ کامل شکل میں موجود ہوتا ہے۔ جو جسمانی لذّتیں ہمیں مادی دنیا میں میسّر آتی ہیں وہ محدود ہیں اور زمان، مکان اور کسی ایک دوسری شرائط سے منسلک ہیں نیز انھیں اپنی منافات اور ضد سے گتھم گتھا ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر لذّت کے مقابلے میں سیکڑوں موانعات موجود ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک انھیں باطل کرنے کے لیے کافی ہے یا ابتداء سے ان لذتوں کو پیدا ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

یہ مزاحمتیں اس دنیا کے مادّے کی بنا پر ہیں اور وہی ہے جو ان تصادمات کو وجود میں لاتا ہے۔ اگر ہم اس سے آگے نکل جائیں جہاں مادہ موجود نہ ہو تو یہ تصادمات بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ انسان خواب میں دلکش مناظر دیکھتا ہے لیکن اس وقت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ بالآخر خواب کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے مرئی وجود یعنی جو چیز خواب میں دیکھی جائے اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں۔ پھر یہ بحث بھی کی گئی ہے کہ

آیا عالمِ رؤیا میں جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہ ادراکی قوتوں کی پیداوار ہوتی ہیں یا ان قوتوں سے قطع نظر وہ چیزیں ایک الگ حقیقت اور ایک مستقل وجود ہوتی ہیں؟ دُوسرے لفظوں میں یہ کہ آیا ان کا مرتبہ نفس کا ہے یا اس کے علاوہ ہے؟

بہرحال جو کچھ بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیزیں خواب میں دیکھی جائیں ان میں مادہ، زمان اور مکان نہیں ہوتا اور نہ ہی مادّی تصادمات ہوتے ہیں۔ مثلاً یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم ایک گھنٹہ سوتے ہیں اور ایک سال خواب دیکھتے ہیں یعنی مسلسل ایسے واقعات دیکھتے ہیں کہ اگر بیداری کی حالت میں رونما ہوں تو انھیں وقوع پذیر ہونے کے لیے ایک سال کی مدّت درکار ہو۔ تاہم یہ مناظر زمان، مکان اور مادے سے بے نیاز ہوتے ہیں اور ان کے نتیجے میں لذّت یا غم اور دُکھ بھی ملتا ہے۔ انسان کبھی بے حد خوش ہوتا ہے اور کبھی غمگین ہو جاتا ہے اور پریشانی کے عالم میں خواب سے بیدار ہو جاتا ہے۔

خواب کی یہ صورتیں اگر مادّے پر واقع ہوتیں تو اپنا اثر چھوڑتیں اور اب بھی جب کہ عالمِ رؤیا میں یہ مادّے پر واقع نہیں ہوئیں اور مادّے سے الگ ظاہر ہوئی ہیں، پھر بھی ان سے وہی آثار وابستہ ہیں۔ یہ تاثیر بجائے خود وجود اور ہستی کی دلیل ہے، ورنہ جس چیز کی کوئی ہستی ہی نہ ہو وہ کیونکر اثر پیدا کر سکتی ہے؟

پس ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ لذّت بخش مادی صورتیں مادے کے بغیر بھی موجود اور مؤثر ہو سکتی ہیں اور مسلّمہ طور پر

یہ مرحلہ زیادہ بلند اور زیادہ کامل ہے۔

تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ان صورتوں کا بھی حساب اور حدیں ہیں۔ یعنی ہر لذّت، ہر صورت سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم ذہنی لذّت انسان کے چہرے سے حاصل کرتے ہیں اور کھانے پینے کی لذّت اشیائے خورد ونوش کی صورتوں سے پاتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا چاہیے کہ یہاں بھی کسی حد تک کثرت اور جُدائی کی حکومت ہے اور یہ بھی اس دنیا کے کمال میں ضعف اور کمی کی دلیل ہے۔

اور اس سے بالاتر وہ مقام ہے جہاں حدوں اور اندازوں کا وجود نہیں، بلکہ جو کچھ ہے وحدت اور جمع ہے۔ وہاں کمالات ایک دُوسرے سے الگ اور بیگانہ نہیں ہیں اور ہر کمال دوسرے کمال میں گندھا ہوا ہے۔ انسان جو کچھ دیکھتا ہے، وہی سنتا ہے اور جو کچھ سُنتا ہے، وہی دیکھتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ مرحلہ زیادہ کامل اور صورتوں اور مثالوں کے مرحلے سے بلند تر ہے۔

اس ترتیب کی رُو سے تین حصّے مل کر ساری کائنات کو تشکیل دیتے ہیں، یعنی مادیات کی دنیا، صورتوں اور مثالوں کی دنیا اور کامل مجردات کی دنیا کہ جس میں مادیت کو کوئی دخل نہیں اور نہ ہی وہ اس کی حدود سے مربوط ہے۔ ان تینوں درجوں میں سے ہر ایک اپنے سے نیچے والے درجے کے مقابلے میں کامل اور اپنے سے اوپر والے درجے کے مقابلے میں ضعیف اور ناقص ہے۔

دنیا اور انسان کی تدریجی ترقی

عالمِ وجود کی بنیاد اس انداز سے نہیں رکھی گئی کہ ہر موجود اپنی جگہ پر رہے اور ساکن رہے۔ یعنی جہانِ ہستی پر بے حرکتی اور جمود کی حکومت نہیں ہے، عالمِ وجود متحرک اور انعطاف پذیر ہے۔ لہذا ایک بے جان موجود زندہ ہو جاتا ہے، بڑھتا ہے اور پھل دیتا ہے اور بالآخر ایک کامل تر مرحلے پر پہنچ جاتا ہے۔

کائنات کا نظام مسلسل حرکت اور تدریجی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ناقص کامل اور کامل کامل تر ہو رہے ہیں۔ انسان بھی اس دنیا کے موجودات میں سے ایک ہے اور بے حرکت اور جامد نہیں ہے بلکہ حرکت اور تدریجی ترقی کا اہل ہے۔

انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا مادی دنیا میں کی ہے اور اس کے لیے ہر لذّت میں رنج والم موجود ہے۔ تاہم وہ اس بات کا اہل ہے کہ ایک بلند تر منزل پر پہنچے، جہاں اسے لذّتیں نصیب ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ رنج والم کی آمیزش نہ ہو جو کہ مادّے سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس مرحلے سے بھی اوپر جائے کہ جہاں صورتیں اور مثالیں نہ ہوں، جہاں پورا پورا کمال، قدرت، سرور اور نیک بختی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ ذاتِ حق سے پیوست ہو جاتا ہے:

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی.

بے شک (سب کو) تمھارے پروردگار کی

طرف پلٹتا ہے۔ (سورۂ علق - آیت ۹)

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک دوسرا انسان جو مادی چیزوں سے انس اور محبت رکھتا ہو، اسے اس دلدل سے نکالنے کی خواہ کتنی کوشش کی جائے وہ پھر مادّے کی طرف لوٹ جاتا ہے۔یا۔ وہ اپنی ذات اور فطرت کے تقاضے کے مطابق کتنا ہی اس سے باہر نکلنے کی خواہش کرے لیکن جو پست اور بری صفات اس میں پیدا ہوگئی ہوں وہ اسے پھر مادّے کی جانب واپس لے جاتی ہیں اور قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق:

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا.

وہ جب بھی اس میں سے نکل جانے کا ارادہ کریں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے۔

(سورۂ سجدہ - آیت ۲۰)

کیونکہ اس کی ذات اور اس کی روح کی گہرائی آتشی اور مادّی ہوجاتی ہے اور اس کی فطرت بھی ایسی ہی ہوجاتی ہے۔

اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے لوگوں کے درجے

لوگ اپنے اعتقادات اور اعمال کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔کچھ لوگ برائیوں میں مبتلا ہیں لیکن ان کے اعتقادات صحیح ہیں۔کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے عقائد بھی درست

نہیں اور وہ ہر لحاظ سے نقصان میں ہیں۔ قرآن مجید انھیں سخت قابلِ نفرین اور پست شمار کرتا ہے[1] اور بنیادی طور پر وہ بحث کے دائرے سے خارج ہیں۔

جہاں تک باایمان اور صالح لوگوں کا تعلق ہے، ان کے تین طبقے ہیں:

(۱)۔ وہ لوگ جو عبادت کرتے ہیں لیکن دُنیاوی خواہشات اور لالچ میں ڈوبے ہوئے ہیں، انھیں فقط لذّت حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ یہ لوگ جو عبادت انجام دیتے ہیں وہ جسمانی لذتوں کی خاطر ہوتی ہے۔ اگر ان کے حالات کی خوب چھان بین کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ درحقیقت جسمانی لذتوں کے عاشق ہیں اور اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ دنیاوی لذتیں فانی اور بے مایہ ہیں، انھیں بقا اور دوام حاصل نہیں اور ہر لذت کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم اور دکھ لگا ہوا ہے۔ پس اگر دنیا جاودانی ہوتی، اس کی لذّتوں میں رنج والم کی آمیزش نہ ہوتی تو ان لوگوں کا اصلی مقصد پورا ہوجاتا اور اس کے علاوہ انھیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی لیکن وہ کیا کریں کہ دنیا جاودانی نہیں ہے اور اس کی لذتیں رنج اور دکھ سے خالی نہیں ہیں، لہٰذا وہ آخرت کے پیچھے بھاگتے

---

[1] سورۂ فرقان اور سورۂ مدثر میں سے ہر ایک کی آیت ۵۰ ملاحظہ ہو۔

ہیں تاکہ ان کا دکھ اور درد کے بغیر جسمانی لذتیں حاصل کرنے کا مقصد پورا ہوجائے۔ ان لوگوں کا نفس مادّی اور جسمانی مرحلے سے آگے نہیں بڑھا، انھوں نے اس منزل سے آگے قدم نہیں رکھا اور جسم کے کمال سے بڑھ کر کسی کمال کی خواہش نہیں کی یا انھیں بنیادی طور پر اس سے برتر کمال کا پتا ہی نہیں چلا اور وہ کسی ایسے کمال کے معتقد ہی نہیں ہوتے۔

۲۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ شامل ہیں جو جہنّم کی آگ سے بچنے کی خاطر عبادت بجالاتے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد بھی جسم کی آسائش کے مرحلے سے بلند تر نہیں ہے، درحقیقت انھوں نے اپنی نفسانی خواہشات کے حصول کے لیے خدا کو ایک واسطہ قرار دے رکھا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے عبادت کو خدا کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہو۔ پس فی الحقیقت وہ اپنی خواہشات کی تعظیم کرتے ہیں اور انھی کے آگے سجدے بجالاتے ہیں کیونکہ وہی ان کی محبوب ہیں اور چاہنے والا محبوب تک پہنچنے کے وسیلے کے سامنے نہیں بلکہ اپنے محبوب کے سامنے کورنش بجالاتا ہے۔

۳۔ تیسرے طبقے سے ان لوگوں کا تعلق ہے جن کا حقیقی مقصد خدا کی عبادت کرنا اور اس کا شکر بجالانا ہے۔ وہ اس مادی دنیا سے اپنا تعلق منقطع کرلیتے ہیں اور عالمِ بالا کی سیر کرتے ہیں، وہ بُلبل کی مانند ہیں جس کے دِل میں گلاب کے حسن

کی محبّت کے سوا کوئی چیز تحریک پیدا نہیں کرسکتی، وہ خدا کے حضور میں رکوع اور سجدے بجا لاتے ہیں۔

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، وہ نہج البلاغہ کی حِکَم و نصائح میں سے ایک ہے۔ نیز ایک ایسی ہی روایت امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل کی گئی ہے[1]

خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ.

میں نے جنّوں اور انسانوں کو کسی مقصد کے لیے پیدا نہیں کیا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (سورۂ ذاریات - آیت ۵۶)

عبادت اور پرستش "توجّہ اور تذلّل" ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کا آخری ہدف جو ہر موجود کا آخری کمال بھی ہے، وہ خدا کی عبادت کرنا اور اس کی جانب متوجہ ہونا ہے۔

درحقیقت مخلوق کے وجود کا ہدف خود خدا کی ذات ہے، عبادت خود ہدف نہیں، بلکہ اس ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔

خُدا پھر فرماتا ہے:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ.

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، نری کھری اسی

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۲۲۹ ـ خصالِ صدوق، باب ثلاثہ۔

کی عبادت کرو اور اسی سے دُعا مانگو۔

(سورۂ مومن - آیت ۶۵)

"اِخلاص" کا مادہ خَلَاصُ ہے اور اس کے معنیٰ کسی چیز کو آلودگی سے پاک کرنے کے ہیں۔ اس آیت کی ترتیب بہت خوبصورت واقع ہوئی ہے کیونکہ اِلٰہ کے معنیٰ معبود کے ہیں۔ پہلے تو یہ آیت بتاتی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ اور پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے دعا مانگو اور دین کو — جو انسان کے معنوی توجہات سے عبارت ہے — اس کی خاطر غیروں سے پاک کرو اور فقط اسی کی طرف نگاہ ڈالو۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ

رسولِ اکرمؐ اس قدر روئے کہ بے حال ہو گئے، لوگوں نے کہا: کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ اس نے آپ کے تمام سابقہ اور آئندہ گناہ[1] بخش دیے ہیں (سورہ فتح - آیت ۲) آنحضرتؐ نے جواب میں کہا: کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں؟" [2]

شکر اچھّائیوں اور خوبصورتیوں پر تعریف کرنا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی حقیقت خدا کی جانب توجّہ کرنا اور اس کی تعریف

---

[1] یہاں گناہ کا عام مفہوم مراد نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ پہلے پچھلے الزامات سے بری ہو چکے ہیں۔

[2] مناقب ابن شہرآشوب۔

کرنا ہے کیونکہ وہ جمیل ہے۔

خواجہ حافظ فرماتے ہیں :

"ایک بُلبل گلاب کی ایک خوبصورت پتی چونچ میں پکڑے ہوئے تھی اور اس کے ساتھ ساتھ نالہ وفریاد بھی کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ عین وصل کی حالت میں اس آہ وزاری کے کیا معنیٰ ہیں ؟ اس نے جواب دیا کہ معشوق کے جلوے نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے۔"

اِس قسم کی عبادت حصار کو توڑنے اور جسم اور جسمانی دُنیا سے باہر جست لگانے سے پیدا ہوتی ہے اور یہی قدس اور معنویت کی دنیا میں انسان کا حقیقی سفر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا دل اور روح عشق ومحبت سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ وہ وحدت اور خُدائے احد کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ وہ اس کی بارگاہ میں ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے اور پھر دل اور جان اس کے سپرد کر دیتا ہے۔

خُدا کی معرفت کے طریقے

خدا کی معرفت اور اس تک پہنچنے کی دو[۲] صورتیں ہیں :

(۱) کبھی یہ وصال فکری اور خیالی ہوتا ہے اور

(۲) کبھی شہود اور رؤیتِ قلبی ہوتا ہے۔

بہت سی روایات میں فکری وصال کو معرفت نہیں گردانا گیا

اور حقیقی معرفت کو اس سے نفی کر دیا گیا ہے کیونکہ اس صورت میں درحقیقت انسان کی توجہّ اپنے ذہنی خیالات کی جانب ہوتی ہے اور وہ اپنے ادراک کی بنائی ہوئی چیز کی پرستش کرتا ہے۔

جہاں تک رؤیت کا تعلق ہے تو یہ امر مسلّم ہے کہ خدا کو دیکھنا ناممکن ہے۔ لیکن اس قول کا اطلاق آنکھوں سے دیکھنے پر ہوتا ہے اور یہ بات (کہ خدا کو آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے،) مسلمانوں کے کچھ فرقوں کے علاوہ کسی نے نہیں کہی۔ باقی اسلامی فرقے اور اسی طرح بہت سے غیر مسلم مذاہب بھی خدا کو رؤیت سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ پھر عقل بھی اس رائے کی سب سے بڑی مؤیّد ہے کیونکہ خدا زمان اور مکان میں نہیں سماتا تاکہ آنکھ اس کا احاطہ کرسکے اور اسے دیکھ سکے۔

لیکن جو کچھ عارف لوگ کہتے ہیں ـــــ اور روایات اور آیات سے بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں پتا چلتا ـــــ وہ یہ ہے کہ خُدا کی رؤیت ـــ عینی نہیں، شہودی ہے۔ یعنی ہم خدا کو نہ تو محدود کرسکتے ہیں اور نہ اس کا اندازہ مقرر کرسکتے ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح ہر موجود کے باہر خدا ہے، اسی طرح اس کے اندر اور اس کی رُوح کی گہرائیوں میں بھی خدا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ

وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ۔

ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (سورۂ قٓ۔ آیت ۱۶)

یہ مکانی نزدیکی نہیں ہے، بلکہ واقعی اور حقیقی قرب اور اتصال ہے اور اگر ممکن موجودات (اور ذاتِ الٰہی کے علاوہ سبھی ممکن ہیں) شہود کے اس مرتبے سے جدا ہوجائیں تو پھر وہ ممکن نہیں رہیں گے بلکہ خود مستقل موجود بن جائیں گے اور خدا سے بے نیاز ہوجائیں گے۔ اصولاً مخلوق ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ موجود کی ہستی اور اس کی ذات کے باطن کی بنیاد ہستی بخشنے والے یعنی خدا کے ساتھ وابستہ ہو۔ جس طرح انسانی ذہن کی بنائی ہوئی شکلیں توجّہ دینے سے موجود رہتی ہیں اور ذرا سی غفلت برتی جائے تو ذہن کی لوح سے نابود ہوجاتی ہیں، وہی حیثیت خدا کی عظمت کے سامنے جہانِ ہستی کی ہے کیونکہ وہ اس کی مخلوق اور معلول ہے۔

جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس شہودی کیفیت کا علم اور اس کی جانب توجّہ دینا ہے۔ اس سے مراد ذہنی یادداشت نہیں ہے بلکہ خدا کے ساتھ واقعی ارتباط کو سمجھنے اور حقیقی معنوں میں اس ارتباط تک پہنچنے کے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو تدریجی ترقی اور عبادت کا راستہ طے کیے بغیر (ان معنوں میں جن میں عبادت کی حقیقت بیان کی گئی ہے) کسی کو میسر نہیں آسکتی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا ۔

جو شخص اپنے پروردگار سے ملاقات کا

امیدوار ہو اسے چاہیے کہ اچھے کام کرے۔

(سورۂ کہف - آیت ۱۱۰)

پھر ارشاد ہوا ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ. أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ. أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَاءِ رَبِّهِمْ. أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ.

ہم عنقریب اپنی نشانیاں اطراف عالم میں اور خود ان کے باطن میں انھیں دکھا دیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہی حق ہے۔ کیا تمھارا پروردگار کافی نہیں ہے جب کہ وہ ہر چیز پر شہید ہے۔ یہ لوگ اپنے پروردگار کے رُوبرو حاضر ہونے کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ وہ یقیناً ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(سورۂ حٰمٓ سجدہ - آیات ۵۳-۵۴)

لفظ شَہِید شہادت سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ معاینہ اور موجودگی کے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ میں شاہدِ مجلس تھا، یعنی میں مجلس میں موجود تھا اور میں نے اس کی کیفیت اور وضع ملاحظہ کی یا یہ کہا جاتا ہے کہ میں فلاں واقعہ کا شاہد ہوں، یعنی اس کا وقوع پذیر ہونا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ممکن ہے کہ یہاں "شہید" ان معنوں میں ہو کہ خدا ہر چیز کا مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان معنوں میں ہو کہ تمام موجوداتِ عالم خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسے دیکھتے ہیں۔ اس صورت میں شہید مشہود کے معنیٰ میں ہوگا۔

اس پیرایہ میں سیاق اور کلام کا انداز دوسرے معنوں کی تائید کرتا ہے، کیونکہ یہ آیات توحید اور خدا کی صفات کے بارے میں نہیں ہیں کہ وہ فرمائے کہ اس کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز پر شاہد ہے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ خدا لوگوں کو فطرت سے آشنا کرے اور یہ چیز قدرتی طور پر پہلے معنوں کے مقابلے میں دوسرے معنوں سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

دوسری آیت میں خدا سے ملاقات کے منکرین کو فقط اتنا جواب دیا ہے کہ اس کی ذات ہر شے پر محیط ہے۔ یعنی جب صورت یہ ہے کہ خدا ہر چیز پر محیط ہے اور کوئی چیز اس کے بغیر نہیں ہے تو وہ اس سے ملاقات کے بارے میں کیسے شک کرتے ہیں؟

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ لقاء سے مراد موت ہے، لیکن اگر مراد موت ہوتی تو منکرین کو یہ جواب دینے کے کوئی معنیٰ نہ ہوتے کہ خدا ہر شے پر محیط ہے اور اس کے بھی کوئی معنیٰ نہ ہوتے کہ موت کی توضیح احاطۂ خدا سے کی جائے اور اس پر استدلال کیا جائے۔

امام حسین علیہ السلام دعائے یومِ عرفہ میں فرماتے ہیں:

اَیَکُوْنُ لِغَیْرِکَ مِنَ الظُّھُوْرِ مَا لَیْسَ لَکَ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الْمُظْھِرُ لَکَ ؛ عَمِیَتْ عَیْنٌ لَا تَرَاکَ عَلَیْھَا رَقِیْبًا وَخَسِرَتْ صَفْقَةُ عَبْدٍ لَمْ تَجْعَلْ لَهٗ مِنْ حُبِّکَ نَصِیْبًا.

کیا تیرے سوا کوئی ایسا ظہور اور جلوہ رکھتا ہے کہ تجھے ظہور دے اور تیری دلیل ہو۔ اندھی ہے وہ آنکھ جو تجھے اپنا شاہد نہ سمجھے اور نقصان دہ ہے وہ عشق جسے تو نے اپنی محبت سے بہرہ مند قرار نہ دیا ہو۔

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ جلوہ گری پوشیدہ ہوجانے کا موجب بن جاتی ہے۔

اِس حقیقت یعنی خدا کے شہود کی واقعیت سے آگاہی کی بنا پر ہی انسان نے اپنے تصور اور ادراک کی بنائی ہوئی چیزوں سے ایک قدم آگے بڑھایا ہے ـــ یعنی خیال سے آگے حقیقت کی جانب ـــ خدا کو واقعاً پایا ہے۔

انسان کے کمال کے سفر کا راستہ یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اور ہر چیز کے مقابلے میں خدا کا طالب اور اس کی ذات سے ملحق ہو اور اسی مشاہدے میں حقیقی حسن اور جمال کو دیکھے۔ اس طرح جب انسان کے اندر عشق کے شعلے بھڑکتے ہیں تو

وہ خدا کے ساتھ خلوت کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ اگر وہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اسی کی خاطر اور اگر کسی چیز سے نفرت کرتا ہے تو وہ بھی اسی کی خاطر کرتا ہے۔ اگر وہ دنیا سے اچاٹ ہے تو اس لیے کہ یہ خدا کو پسند نہیں اور اگر وہ آخرت کی طرف مائل ہے تو اس لیے کہ خدا اسے پسند کرتا ہے، اس لیے نہیں کہ اس میں اس کے جسم کے لیے دائمی لذت کا سامان موجود ہے۔

اپنے آپ کو پانا

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی جانب توجہ دینے کی مذمت کی گئی ہے اور انسان کو اس سلسلے میں خبردار کیا گیا ہے۔ لیکن جب انسان کے نفس اور رُوح کی نوبت آئی ہے تو اسے ان کی جانب توجّہ دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ.

ان لوگوں جیسے نہ بنو جو خدا کو بھلا بیٹھے ہیں اور خدا نے بھی انھیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ وہ لوگ خود بدکردار ہیں۔

(سورۂ حشر۔ آیت ۱۹)

درحقیقت یہ آیت اس مشہور حدیثِ نبوی کے منفی پہلو سے

متعرض ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ۔

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اسی طرح یہ حدیث نبوی مذکورہ آیت کے اثباتی پہلو سے متعرض ہے اور علمی اصطلاح میں کہنا چاہیے کہ یہ آیت اور حدیث نبوی ایک دوسری کا "عکسِ نقیض" ہیں۔

خداوند تعالیٰ پھر ارشاد فرماتا ہے کہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔

اے ایمان والو! تمھیں چاہیے کہ اپنے آپ کو پالو۔ جب تم راہِ راست پر ہو تو کوئی گمراہ ہونے والا تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(سورۂ مائدہ - آیت ۱۰۵)

اِسی طرح اور بہت سی آیات ہیں جن میں انسان کے نفس اور اس کی رُوح کی حقیقت کو اس کی خوش بختی کا معیار قرار دیا گیا ہے ان آیات میں نفس کی جانب توجّہ کو خدا کی جانب توجہ گردانا گیا ہے۔ یعنی انسان اپنے باطن کی طرف راغب ہو اور اپنی توجہ اپنی روح پر مرکوز رکھے اور جو کچھ غیر ہے مثلاً چیزوں کا عدم یا فقدان، تعلقات، وابستگیاں ــــ اپنے آپ سے وابستگی اور دوسروں سے وابستگی ــــ ان سب سے آنکھیں بند کرلے اور سب کو اپنی توجّہ

کے دائرے سے نکال باہر کرے۔ وہ فقط حقیقی ہستی اور وجود مطلق کو دیکھے، کیونکہ یہی دیدار، شہودِ الٰہی، عرفانِ حقیقی اور انسان کے کمال کے سفر کا آخری مرحلہ ہے۔

اور یہ ایسی چیز ہے جو شرعی ریاضتوں کے بغیر یعنی نفس کو رذائل اور گناہ سے پاک کرنے اور اسے فضائل اور حقیقی عبادت سے (جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے) سجانے کے بغیر کسی شخص کو میسر نہیں آسکتی۔

ریاضت کا قوت بخشنا

ریاضت جتنی بھی کی جائے، وہ قطعی طور پر کمال بخشتی ہے اور انسان کے نفس کو تقویت پہنچاتی اور قوت دیتی ہے۔ مثلاً بڑی سخت ریاضتوں کے نتیجے میں تارک الدنیا لوگوں کا نفس اپنے باطن سے باہر کی دنیا میں تصرف کی قوت پیدا کرلیتا ہے اور یہ ایسی چیز نہیں جو کسی کے لیے قابلِ انکار ہو۔

لیکن یہ ریاضتیں شرعی ریاضت کے مقابلے میں بڑی حد تک آسان ہیں، کیونکہ دینی اعمال اور آداب دائمی ہدایات کا ایک سلسلہ ہیں جن کا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بجا لانا انسان کا فرض ہے۔ نیز اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت اپنی نفسانی خواہشات کو کچل دے۔ اس کے برعکس وہ ریاضتیں کچھ مدّت کے لیے ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایسی ریاضتیں ہیں جو انسان کی فطرت اور خلقت کے برخلاف ہیں اور فطرت کے

تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں لیکن اسلامی ریاضتیں نہ صرف یہ کہ فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ درحقیقت ان کی بنیاد ہی فطرت اور اس کی نشو و نما پر رکھی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تارک الدنیا لوگوں کے نفس کی قوّت بے حد معمولی ہوتی ہے اور زمان و مکان کے نقطۂ نگاہ سے مکمل طور پر محدود ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص وقت یا خاص مقام پر غیب کی خبریں دے سکتے ہیں یا تصرّف کر سکتے ہیں۔ لیکن اولیاء اللہ کا تصرّف کرنا یا غیب کی خبریں دینا کسی مخصوص وقت اور مقام تک محدود نہیں ہے۔ پھر یہ قدرتی امر ہے کہ تصرّف کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا، نفس کی قدرت اور اس کے وجود کی وسعت بھی زیادہ ہوگی۔

حدیثِ قدسی جو فریقین نے نقل کی ہے، وہ شاید متواتر اسلامی احادیث میں سے ہے اور اس کے رسولِ اکرمؐ سے صادر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس میں یوں فرمایا گیا ہے کہ بندہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جب اس کا کام خداوندی کام ہوتا ہے، اس کا ارادہ مراد برلانے والا ہوتا ہے اور اس کی خواہش کے ساتھ ہی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ
قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ : مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدٌ بِشَیْءٍ
اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَیَتَقَرَّبُ
اِلَیَّ بِالنَّافِلَۃِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ، فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ
سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ

بِهٖ وَلِسَانَهُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّذِیْ یَبْطِشُ بِهَا. اِنْ دَعَانِیْ اَجَبْتُهٗ وَاِنْ سَاَلَنِیْ اَعْطَیْتُهٗ.

"رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ نے کہا کہ خدائے عزّوجل نے فرمایا: بندہ ایک ایسا عمل بجا لانے سے جو میں نے اس پر واجب کردیا ہے اس قدر میرے نزدیک نہیں ہوتا کہ وہ مجھے زیادہ محبوب ہو لیکن وہ نافلہ بجالانے سے میرے اس قدر نزدیک ہوجاتا ہے کہ میں اسے دوست رکھتا ہوں۔ جب میں اُسے دوست رکھتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بات کرتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں وہ چیز اسے بخش دیتا ہوں۔"[1]

یہ روایت سَنَد اور راویوں کے لحاظ سے معتبر اور قابلِ اطمینان ہے۔

اس حدیث کے دو پہلو ہیں: پہلا، خدا کی بندے سے

---

[1] اصولِ کافی جلد ۱ صفحہ ۲۵۲۔

دوستی اور دوسرا یہ کہ بندے کا عمل خدائی عمل ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید بھی ان دونوں پہلوؤں کی تصدیق کرتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ.

(اے رسولؐ! ان لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ خدا بھی تمھیں دوست رکھے اور تمھارے گناہ بخش دے۔ (سورۂ آلِ عمران - آیت ۳۱)

اور پھر فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ.

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اس کے رسول (محمدؐ) پر ایمان لاؤ تاکہ خدا تمھیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے اور تمھیں ایک ایسا نور عطا فرمائے جس کی روشنی میں تم چل سکو۔

(سورۂ حدید - آیت ۲۸)

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ ایمان اور نیک اعمال سے ایک الٰہی نور حاصل ہوتا ہے، جس کے وسیلے سے مومن شخص لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اور ان کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ حالانکہ

وہ پہلے بھی راستا چلتا تھا اور لوگوں سے میل جول رکھتا تھا لیکن پہلے وہ یہ کام نفس کی قوتوں اور اس کے آلات سے لیتا تھا، اور اب ان کی جگہ الٰہی نور نے لے لی ہے اور وہ یہ کام اس کے وسیلے سے کرتا ہے۔

اس آیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ جو کچھ مقرب بندہ چاہتا ہے، خدا اسے دیتا ہے اور اس کی خواہش سے مرادیں جنم لیتی ہیں۔ خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ جس چیز کو اس کا بندہ پسند نہ کرے وہ واقع ہو، بلکہ جس چیز کو وہ پسند کرتا اور جس کا ارادہ کرتا ہے، خدا بھی اسی کو پسند کرتا ہے اور وہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ یعنی یہ اس کا ارادہ ہے جو اس کی مراد کو خارجی دنیا میں وجود میں لاتا ہے اور دوسرے لفظوں میں چیزوں کی پیدائش کی وجہ اس کی خواہش ہے اور وہی ہستی بخشتی ہے اور یہی وہ چیز ہے، جسے ولایتِ تکوینی کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ قرآن مجید میں بعض چیزوں کی ایجاد کو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ۔

"میں مٹی سے ایک پرندے کی شبیہ بناؤں گا اور پھر اس پر پھونکوں گا تو وہ خدا کے حکم سے اڑنے لگے گا اور میں خدا ہی کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کروں گا اور مُردوں کو زندہ کروں گا اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو میں وہ سب تم کو بتادوں گا۔"

(سورۂ آل عمران - آیت ۴۹)

ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ نے پرندے کی تخلیق اور دوسری باتوں کو اپنے آپ سے نسبت دی ہے اور فرمایا ہے کہ میں یہ کام کرتا ہوں۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میں خواہش کرتا ہوں اور خدا کام کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کام میں خود کرتا ہوں، مگر یہ کہ خدا کے اِذن سے کرتا ہوں۔

یہاں اِذن کے معنیٰ لفظی اجازت کے نہیں ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ خدا انسان کے باطن کو رحمت اور قوّت سے لبریز کردیتا ہے اور اس کے ارادے اور خواہش کو مؤثر اور تخلیق کنندہ بنا دیتا ہے۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر اس موضوع پر یوں ارشاد فرماتا ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰی وَالِدَتِكَ ...... وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ

وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۔ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ ۔

جب خدا نے کہا : اے مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ! میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمھاری ماں پر نازل کی ..... اور اس وقت کو یاد کرو جب تم نے میرے اذن سے مٹی سے پرندے کی ایک شبیہ بنائی اور اس میں میرے اِذن سے پھونکا اور میرے اذن سے وہ اڑنے لگا اور میرے اِذن سے تم نے اندھے اور کوڑھی کو شفا دی اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم نے میرے اِذن سے مُردوں کو زندہ کیا۔ (سورۂ مائدہ - آیت ۱۱۰)

یہاں بھی خدائے تعالیٰ یہ نہیں کہتا کہ ہم نے عیسیٰؑ کی نبوت اور رسالت ثابت کرنے کے لیے پرندے کو پیدا کیا ، یا اندھے اور کوڑھی کو شِفا دی یا مُردوں کو زندہ کیا ، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ " تم نے پیدا کیا ، شفا دی اور زندہ کیا لیکن ہمارے اِذن کے ساتھ "۔ پس یوں ایجاد اور خلق کو واضح طور پر حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیا گیا ہے اور اس طرح انھیں ایک پیدا کرنے والے کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔

سُوال

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حدیثِ قدسی میں مقرب بندے کی خواست کی تخلیق کو خدائے تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے ، یعنی " اگر

وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں وہ چیز اسے بخش دیتا ہوں۔

جواب

یہ چیز اس بات کے منافی نہیں ہے کہ درحقیقت بندے کے مطلوب کی پیدائش خود اس کے ارادے کے زیرِ اثر ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ قرآن مجید میں دنیا کے بہت سے حوادث کو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے، حالانکہ ان کی پیدائش کئی ایک مادی اسباب کی بدولت ہوتی ہے یا اس میں کئی ایک دوسری وجوہ کارفرما ہوتی ہیں۔

مثلاً قرآن مجید کی بہت سی آیات میں مینہ برسنے اور آسمان سے پانی کے نزول کو براہِ راست حق تعالیٰ سے نسبت دی گئی ہے اور اکثر فرمایا گیا ہے کہ

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً .

ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا۔

یا یہ کہ

وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً .

اور اس نے آسمان سے پانی نیچے بھیجا۔

جب کہ ایک اور مقام پر مادی اسباب کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ

مِنْ خِلٰلِہٖ.

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا ہی ابر کو چلاتا ہے پھر وہی اسے باہم جوڑتا ہے۔ پھر وہی اسے تہ بہ تہ رکھتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش اس کے درمیان سے نکلتی ہے۔ (سورۂ نور - آیت ۴۳)

یا مثلاً ایک مقام پر موت اور رُوح کے قبض کرنے کو خدا سے نسبت دی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ.

خُدا ہی نے تمھیں پیدا کیا اور پھر وہی تمھیں موت دے گا اور دنیا سے اٹھا لے گا۔

(سورۂ نحل - آیت ۷۰)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ

قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ.

(اے رسولؐ! ان لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ ملک الموت جو تم پر تعینات ہے وہی تمھاری روحیں قبض کرے گا۔ (سورۂ سجدہ - آیت ۱۱)

یہ مطلب ایک قرآنی حقیقت ہے۔ قرآن مجید جہاں حوادث کو ان کے اسباب سے نسبت دیتا ہے۔ وہاں انھیں خدا سے بھی منسوب کرتا ہے اور علم اور فلسفہ بھی اس چیز کو بطور ایک مسلمہ فطری حقیقت کے تسلیم کرتے ہیں کہ جو مظاہر وجود رکھتے ہیں وہ

جہاں اپنے اسباب کا سہارا لیتے ہیں وہاں ذاتِ حق کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں سابقہ پیغمبروں کے بہت سے معجزوں کو براہِ راست خدا سے نسبت دی گئی ہے، حالانکہ پیغمبروں کے معجزے ایک دوسرے سے متفاوت نہیں، سبھی معجزے ہیں اور سب کی پیدائش میں نبی کا پاک و پاکیزہ نفس مؤثر ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً حضرت عیسیٰ ؑ کے سلسلے میں کہا گیا کہ تم نے یہ، یہ کام ہمارے اذن سے کیے اور حضرت ابراہیم ؑ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ۔

ہم نے فرمایا: اے آگ تو ابراہیم ؑ پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا۔

(سورۂ انبیاء ؑ - آیت ۶۹)

زیر بحث روایت میں بھی یہی صورت ہے۔ حالانکہ بندے کا ارادہ کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے اور اسے ظہور عطا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ فعل خدا کا فعل ہے اور اس سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ خود بندے سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے کہ تمام موجوداتِ عالم خواص اور آثار کے مالک ہیں اور اپنے خواص اور آثار کی نسبت سے سبب اور خالق ہیں یعنی واقعی اپنے خواص کو جنم دیتے ہیں اور ایجاد کرتے ہیں۔

مثلاً جاندار موجودات کئی ایک افعال اور حرکات انجام دیتے

ہیں اور انھیں وجود میں لاتے ہیں یعنی ہستی اور وجود کا میدان ان افعال اور حرکات سے خالی ہوتا ہے اور بعد میں وہ اس میں رونما ہوتے ہیں۔ جب انسان کا ہاتھ لکھتا ہے تو لکھائی کا قائم رہنا انسان کا معلول نہیں بلکہ اس رنگ اور روشنائی کا نتیجہ ہے جس سے لکھا گیا ہے یا اس جسم کی حالت کا نتیجہ ہے جس پر لکھا گیا کہ وہ سیال نہیں بلکہ ثابت ہے، لیکن خود ہاتھ کی حرکت انسان کا معلول ہے اور وہ اسے وجود میں لایا ہے۔

یہاں بھی ہاتھ کی حرکت انسان کا ارادی فعل ہے اور انسان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ خدا کی ذات سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ مختصراً یہ کہ جس طرح ہم موجودات کے آثار اور خواص کے سلسلے میں ایجاد اور خلاقیت کو خود ان سے نسبت دیتے ہیں، اسی طرح معجزوں کے بارے میں ہم خلاقیت کو خود انبیا سے نسبت دیتے ہیں اور انھیں فقط ذریعۂ فعل نہیں سمجھتے۔ ہم اشاعرہ کی طرح نہیں ہیں کہ موجودات کو ان کے آثار و خواص کے لحاظ سے فعل خدا کے ذرائع اور وسائل تصوّر کریں۔

ولایت سے انکار کا اشعری کے عقیدۂ جبر سے ارتباط

اشاعرہ ایجاد اور خلق کو خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے منسوب کرنے کو توحید کے خلاف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

"دُنیا میں ہر فعل براہِ راست خدا کا فعل اور

اس کی ایجاد ہے، یہ موجودات فقط آلات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً آرہ لکڑی کاٹنے کا ایک آلہ ہے اور درحقیقت کاٹنا بڑھئی کا کام ہے، آرہ اس کام کو انجام دینے کا فقط ایک آلہ ہے اور کسی طرح بھی "کاٹنا" اس سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ساری کائنات کے حوادث اور حرکات — پرہیزگار کی اطاعت سے لے کر گنہگار کے گناہ اور مخالفت تک — سب کے سب فقط خدا کا فعل ہیں۔ (مختصراً یہ کہ اشاعرہ کے نزدیک فعل اور ایجاد کے معاملے میں غیرِ خدا فاعل نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ پرہیزگار اطاعت کا آلہ ہے اور گنہگار گناہ کا آلہ ہے۔)

تاہم یہ خیال انسان بلکہ بے زبان اور بے شعور حیوانات کی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی کے پانچویں دفتر میں اس مسئلے پر بحث کی ہے اور انصاف یہ ہے کہ اس پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

یہ خیال عقل سلیم اور فطرت کے خلاف ہے اور حیوانات بھی اس چیز کو سمجھتے ہیں۔ اگر ایک انسان ایک اونٹ یا کتے کو مارے تو وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ انسان اس مارنے کو وجود میں لایا ہے اور اس نے انھیں تکلیف پہنچائی ہے، لہذا انھیں اس

پر غصہ آتا ہے اور وہ اس پر حملہ کرتے ہیں لیکن
اس لاٹھی یا پتھر پر حملہ نہیں کرتے جو ان کے بدن
کو لگتا ہے اور نہ ہی اس پر غصے کا اظہار کرتے ہیں،
وہ جانتے ہیں کہ انسان کی حیثیت آلے کی نہیں بلکہ
وہ خود اس فعل کو وجود میں لایا ہے۔

وہ طرزِ فکر معقول پسندی کی دینداری سے جدائی کی پیداوار ہے اور ریاکارانہ تقدّس کا مظہر اور دین کی حقیقت سے دور ہے، خود قرآن مجید بھی فطرت اور عقل کے مطابق انسان کے افعال اور دوسرے موجودات کی خاصیتوں کو ان سے متعلق سمجھتا ہے لیکن اشعری صاحبان اس مسلمہ قرآنی حقیقت کی تاویل کرتے ہیں اور اپنے اس اندازِ فکر کو کمالِ توحید اور یگانہ پرستی گردانتے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہر علت اپنے معلول یعنی تخلیق کردہ چیز کے بارے میں ایجاد کی قدرت رکھتی ہے۔ ہم اسے ولایتِ تکوینی (یعنی ایک موجود کا دوسرے موجود پر واقعی اور حقیقی تسلط) کہتے ہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ خدا نے موجودات میں سے ہر ایک کو اس کے وجود کی وسعت کے مطابق اس قسم کی ولایت سے حصّہ دیا ہے اگرچہ اس کی عظمت کے مقابلے میں ان کا حصہ اور نصیب بے حد تھوڑا ہے۔

پھر یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسان کی ایجاد کی قوت اس کے نفس کے ارتقاء کے متوازی ہے اور روحِ انسانی، شرعی اور بعض

اوقات غیر شرعی ریاضتوں کے نتیجے میں جتنی طاقتور ہوتی ہے اتنی ہی انسان کی قوتِ ایجاد بڑھ جاتی ہے۔

نیز یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ولایتِ تکوینی کے عام اصول کا انکار یا بالفاظِ دیگر خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے فاعلِ حقیقی ہونے سے انکار "جبر" پر اعتقاد رکھنے کا موجب ہے۔

اشاعرہ کے طرزِ فکر کا دُوسرے اسلامی فرقوں پر اثر

اہلِ سُنّت میں اشعری[1] کے طرزِ فکر کے بہت سے حامی ہیں،

---

[1] ابوالحسن اشعری (۲۷۰ھ-۳۲۰) ابوعلی محمد بن عبدالوہاب المعروف "الجبائی" کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جو اسی کے نام سے منسوب ہوکر اشعری کہلایا۔

اشاعرہ کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے:

۱ـ قرآن مجید قدیم ہے۔

۲ـ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ یعنی وہ صحیح اور غلط اعمال کے انتخاب میں آزاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے تمام اعمال پہلے سے مقدر کیے ہوئے ہیں۔

۳ـ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں۔

عقیدۂ جبر کی بنا پر اشعری چونکہ انسان کو فاعلِ مختار نہیں سمجھتے اس لیے وہ یزید اور دوسرے خلفاء کے بُرے اعمال کو جائز قرار دیتے ہیں۔

ان کی ایک بڑی اکثریت اسلامی عقائد اور معارف کے بارے میں اس کے خیالات سے متفق رہی ہے۔ پھر مختلف اسلامی فرقوں کے مابین میل جول کے نتیجے میں یہ اور بھی مؤثر ہوئی اور وہ فرقے گوناگوں شعار رکھنے کے باوجود اس ایک نظریے میں متحد ہو گئے۔

بہت سے لوگ ولایتِ تکوینی کے ـــــ ان معنوں میں کہ پیغمبر یا ولی کا نفس مطہرؑ تکوین کے نظام میں تصرف کرسکتا ہے ـــــ منکر ہو گئے اور اس قسم کی ولایت پر اعتقاد کو الحاد اور شرک کہنے لگے حتیٰ کہ بارھویں صدی کے وسط میں یعنی آج سے کچھ اوپر ۲۵۰ سال پیشتر وہابیہ فرقے کا بانی محمد بن عبدالوہاب حجاز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مکمل یگانہ پرستی اور اسلامی عقیدۂ توحید کی تجدید کے نام سے ہر چیز کو بدعت، کفر اور شرک کا نام دے دیا۔ وہ اپنی کتابوں کتاب التوحید اور کشف الشبہات میں صالحین اور پاک لوگوں سے توسّل اور ان کی تکوینی اور واقعی برتری اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر اعتقاد کو نظامِ تکوین میں غیر اللہ کے تصرف کا عقیدہ گردانتے ہوئے شرک قرار دیتا ہے اور آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے استدلال کرتا ہے۔

فرید وجدی نے اپنے دائرۃ المعارف کی دسویں جلد میں مادہ وھب کے تحت اس کے کچھ خیالات بیان کیے ہیں اور اس کے مقابل پُرزور دفاع کیا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں یہ غلط نظریہ شیعی دنیا میں بھی سرایت کر گیا اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو نبی اور ولی (محمد بن عبدالوہاب

کی اصطلاح میں صالحین) کے مقام کو دُوسرے لوگوں کے مقام سے برتر نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ان کا علم بھی کچھ ذہنی امور کے جاننے تک محدود ہے اور انھوں نے باطن کے مرحلے میں قدم نہیں رکھا ــــ یا بنیادی طور پر کسی ایسی چیز کا ہونا محال ہے اور اس پر اعتقاد رکھنا توحید کے منافی ہے۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ پیغمبر یا امام کو علم اور عقل میں دوسرے لوگوں سے افضل سمجھتے ہیں۔

یُوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایتِ تکوینی کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ ایک انسان آزادانہ طور پر خدا کے مقابلے میں کوئی چیز پیدا کرے، کائنات کے نظام میں تصرّف کرے اور اس کا ارادہ خدا کے ارادے سے جُدا ہو۔

اس عقیدے کی مذکورہ بالا صورت کے شرک ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی نہیں کہ نظامِ کائنات کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا شرک ہے، بلکہ اگر کوئی شخص کسی انسان کی معمولی سے معمولی جسمانی حرکت کو بھی آزادانہ سمجھے اور اس کے ارادے کو خدا کے ارادے سے الگ تصوّر کرے تو اس کا عقیدہ یقیناً شرک ہے کیونکہ وہ خدا کی مطلق فاعلیت کے مقابلے میں ایک دوسرے مستقل فاعل پر اعتقاد رکھتا ہے۔

لیکن ہماری بحث کی بنیاد یہ ہے کہ جیسے ہم انسان یا دوسری موجودات کی عام حرکات کو خود ان سے نسبت دیتے ہیں اور فی الحقیقت انھیں فاعل سمجھتے ہیں اور یہ اعتقاد توحید کے منافی نہیں ہے ــــ

اسی طرح اس چیز پر اعتقاد توحید کے منافی نہیں کہ ایک انسان حقیقی ارتقا اور روحانی قوت کے نتیجے میں ایک چیز پیدا کر سکتا ہے اور یہ عمل انسان کے اپنے ہاتھ کو حرکت دینے یا بات کرنے سے کسی طرح متفاوت نہیں ہے۔

جب یہ عقیدہ رکھنا کہ انسان خود حرکت اور کلام پیدا کرتا ہے، شرک نہیں ہے تو پھر اس چیز پر اعتقاد کہ ایک کامل انسان نے باذن اللہ ایک موجود کو پیدا کیا، کیونکر شرک ہوگا؟ کیا فعل کی بڑائی اس بات کا موجب بن جاتی ہے کہ انسان کا ارادہ اور قدرت خُدا کے ارادے سے الگ ہو؟

جیسا کہ تمام موجودات اپنی عام حرکات اور افعال کے معاملے میں خدا کے ارادے اور قدرت کے ماتحت ہیں، اسی طرح کامل اور پاک لوگ بھی خدا کے ماتحت ہیں اور اس بارے میں ان میں اور اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن مجید اور اولیاء کی ولایتِ تکوینی

یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے نقطۂ نگاہ کے مطابق انبیاء کی ولایتِ تصرّف یعنی ولایتِ تکوینی کے حقیقی اور صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ تاہم جہاں تک غیرِ انبیاء کا تعلق ہے حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سباؔ کے قصّے میں ارشاد ہوا ہے کہ :

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ . قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ . قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ .

(سلیمانؑ نے) کہا ، اے لوگو ! تم میں سے کون ایسا ہے کہ قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے سامنے فرماں بردار بن کر آئیں اس (ملکۂ سبأ) کا تخت میرے پاس لے آئے۔

جنّوں میں سے ایک دانا جنّ نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں وہ تخت آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اس پر قدرت رکھتا ہوں اور ذمے دار (امین) ہوں۔

پھر اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا کہا ؛ میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے وہ تخت آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں (اور بس اتنے میں ہی وہ لے آیا)۔"

(سورۂ نمل ۔ آیات ۳۸ تا ۴۰)

یہاں جنّوں میں سے ایک طاقت ور شخص کی اور ایک ایسے شخص کی ولایت تصرّف ثابت ہوتی ہے ، جس کے پاس کتاب کا

کچھ علم تھا اور قوّت اور طاقت کو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو بے حد کم وقت میں ___ ایک سیکنڈ سے بھی کم مدّت میں ___ اتنا فاصلہ طے کرسکتی ہے، جسے آج کل کی سائنس اور صنعت کے برق رفتاری کے دور میں بھی طے کرنا ممکن نہیں۔

جہاں تک جنّ کا تعلق ہے، قرآن مجید نے اس کی قدرت اور ولایت کے راز کی جانب اشارہ نہیں کیا لیکن دوسرے شخص کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کی قدرت اور ولایت کا سبب یہ تھا کہ وہ کتاب کا کچھ علم رکھتا تھا۔

اس آیت میں جس "علمِ کتاب" کا ذکر ہے، اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سے امکانات بتائے ہیں۔ لیکن اس سے مراد خواہ کچھ بھی ہو اتنی بات مسلمہ ہے کہ یہ علم لفظی نہیں، ایک قوت بخشنے والی اور قدرت پیدا کرنے والی حقیقت تھی۔

"کتاب کے کچھ علم" اور کتاب کے عِلم میں فرق ہے اور جب کتاب کا کچھ علم "ولایتِ تصرّف" کا موجب بن سکتا ہے تو لازمی طور پر پوری کتاب کا علم زیادہ مؤثر اور زیادہ قوت بخشنے والا ہوگا۔

پھر ارشاد ہوا ہے کہ

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا. قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ. وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ.

کافر کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو۔ تم ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت

کی) گواہی کے لیے خدا اور وہ شخص جس کے پاس آسمانی کتاب کا علم ہے، کافی ہیں۔

(سورۂ رعد - آیت ۴۳)

اکثر مفسّرین اس کے قائل ہیں کہ اس شخص سے مراد امام علی ابن ابیطالبؑ ہیں۔

رکوع میں زکوٰۃ کی آیت

جس آیت سے زیرِ بحث ولایت یعنی ولایت تصرّف کا پتا چلتا ہے وہ یہ ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ.

تمھارے ولی تو بس خدا اور اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔

(سورہ مائدہ - آیت ۵۵)

اس آیت پر دو لحاظ سے بحث کی جاسکتی ہے:

ایک یہ کہ مومنین (اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیا اس سے عام مومنین مراد ہیں یا ایک مخصوص شخص مراد ہے؟

اور دوسرے یہ کہ "ولی" سے کیا مراد ہے؟

پہلا نکتہ

اہلِ سُنّت کے کئی مفسّرین نے کہا ہے کہ چونکہ یہ آیت ان آیات کے بعد واقع ہوئی ہے جن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی قائم کرنے سے (جسے ولایتِ نصرت کہا جاتا ہے) منع کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ آیت بھی خدا، پیغمبرؐ اور مومنین کے لیے ولایتِ نصرت کی توثیق کرتی ہے، یعنی خدا، پیغمبرؐ اور مومنین تمھاری مدد کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان آیات کا مقصد ایک ہی ہے اور اس آیت سے جو کچھ مراد ہے اس کی جانب اشارہ سابقہ آیات سے ملتا ہے۔ عمومی طور پر ایک جگہ کچھ لوگوں سے دوستی قائم کرنے اور ان کی مدد کرنے سے منع کیا گیا ہے اور دوسری جگہ خُدا، پیغمبرؐ اور مومنین سے دوستی اور ولایتِ نصرت کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے۔

ان حضرات نے تو یہ کہا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے گو یہ امر مسلمہ ہے کہ سورۃ مائدہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے آخری سال میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اس کی سب آیات ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوئیں کیونکہ اس سورے کی آیات کے درمیان ہم ایسی آیات بھی دیکھتے ہیں جو حجۃ الوداع سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور خود ان کا مضمون بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے، مثال کے طور پر آیتِ وضو (چھٹی آیت) اور چور

کی سزا کے بارے میں (۳۸ ویں آیت) ۔

پس اگر ایک آیت دوسری آیت کے بعد واقع ہو تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان کا تعلق ایک ہی مضمون سے ہے۔ اسی طرح دو آیتوں میں کوئی مناسبت ہونا بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ دونوں اکٹھی نازل ہوئی ہیں یا دونوں ایک ہی مطلب سے متعرض ہیں۔

پھر سابقہ آیات میں تو اس چیز سے منع کیا گیا ہے اور ان کی ابتدا میں کہا گیا ہے کہ

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ. وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ.

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا ولی نہ بناؤ۔ ان میں سے بعض، بعض کے ولی ہیں، اور تم میں سے جو کوئی انھیں اپنا ولی بناتا ہے وہ انھیں میں سے ہے۔ (سورۂ مائدہ - آیت ۵۱)

یہ ولایتِ نصرت نہیں ہے کیونکہ دو گروہوں کے درمیان مدد کا عہد ان میں سے کسی گروہ کو دوسرے گروہ کا حصّہ قرار نہیں دیتا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ولایتِ نصرت سے منع کیا جائے اور اس کی دلیل یہ دی جائے کہ ان میں سے بعض بعض دوسروں کے ولی ہیں۔ اس کے برعکس دوستی اور محبّت کی ولایت دو گروہوں کے درمیان مکمل وابستگی کا موجب ہوتی ہے اور انھیں اعمال و اخلاق اور قومی

اور روحانی خصوصیتوں کے بارے میں ایک دوسرے کے نزدیک کردیتی ہے۔ چنانچہ جو دلیل اس آیت میں دی گئی ہے، وہ بطور لازم اس صورت کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک پیغمبر ان معنوں میں لوگوں کا ولی ہو کہ ان کی مدد کرے، بلکہ یہ لوگ ہیں، جنھیں چاہیے کہ پیغمبروں کی مدد کریں۔ یعنی وہ جن خطرات سے دوچار ہوں انھیں دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو قربان کردیں۔

چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۔ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۔

جس طرح مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا تھا کہ خدا کی طرف بلانے میں میرے مددگار کون ہیں تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ہم خُدا کے انصار ہیں۔ (سورۂ صف - آیت ۱۴)

اور پھر فرماتا ہے:

لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۔

اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔

(سورۂ آل عمران - آیت ۸۱)

دین کا تعلق دراصل "رسول" سے ہے، کیونکہ وہی دین لاتا ہے اور اس کی تبلیغ کرتا ہے۔ پس مومنوں کو چاہیے کہ اس کی مدد

کریں۔ ایسا نہیں ہے کہ دین کے مالک تو مومن ہوں اور پیغمبرؐ کے لیے ضروری ہو کہ وہ ان کی مدد کرے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت کا مقصد اور اس سے قبل کی آیات کا مقصد ایک نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آیتِ زکات میں "ولی" سے مراد وہ ولایت ہو جو پیغمبر کی شان سے ہم آہنگ ہو پس وہ یا ولائے محبّت ہے یا ولائے زعامت ہے اور یا ولائے تصرف ہے۔ [1]

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس آیت میں "ولی" کے معنیٰ دوست کے لیے جاسکتے ہیں؟

اوّل تو یہ کہنا چاہیے کہ بنیادی طور پر لفظ "ولی" دوست کے معنوں میں نہیں آیا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں وَلِيُّكُمُ میں شامل لفظ کُمْ کے ذریعے تمام مومنوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

پھر اس کے معنیٰ کیا ہوتے کہ کہا جاتے کہ تم مسلمانوں اور مومنوں کے دوست وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں، جب کہ پہلے سب کو ایک اکائی فرض کر کے ان سے خطاب کیا گیا ہے؟ بلکہ اگر یہ کہنا مراد ہوتا تو کہا جاتا کہ تم ایک دوسرے کے دوست ہو۔ پس "ولی" سے مراد دوست نہیں ہوسکتا۔

اور پھر "ولی" کے معنی خواہ کچھ بھی ہوں، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

---

[1] علامہ محمد حسین طباطبائی۔ تفسیر المیزان جلد ۶ صفحات ۱ - ۵

(جو ایمان لائے ہیں) سے مراد سبھی مؤمن نہیں ہو سکتے بلکہ اگر یہ مراد ہوتی تو اس کی تعبیر اس طرح ہوتی جس طرح اس آیت کی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔

بعض ایمان والے مرد اور عورتیں بعض دوسروں کے ولی ہیں۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۷۱)

لیکن آیتِ زکات میں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (ایمان لانے والوں) سے مراد بعض مؤمن ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بعض مؤمن کون ہیں؟ بعد کے جملوں میں ارشاد ہوا ہے کہ

جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔

اس سے ان "بعض" کا پتا چلتا ہے اور تاریخ اسلام میں امیرالمومنین علیہ السلام[1] کے علاوہ اور کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں جس نے نماز پڑھتے ہوئے

---

[1] تفسیر روح المعانی، تفسیر در المنثور، تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر ثعلبی، تفسیر بیضاوی، تفسیر خازنی، تفسیر نسفی، تفسیر محی الدین العربی، تفسیر طبری، تفسیر واحدی، تفسیر ابو البرکات اور تفسیر نیشاپوری۔ اس کے علاوہ دیکھیے:

ابن صباغ مالکی (الفصول المہمہ)۔ ابن طلحہ شافعی (مطالب السئول)۔ سبط ابن جوزی (تذکرۃ الخواص)۔ الکنجی شافعی (کفایت الطالب)۔ اخطب خوارزمی (مناقب)۔ حموینی (فرائد السمطین)۔ قاضی عضد الدین (المواقف)۔ محب طبری (ریاض النضرہ، ذخائر العقبیٰ)۔ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ)۔ سیوطی (جامع الجوامع)۔ ابن حجر (صواعق المحرقہ)۔ شبلنجی (نور الابصار)۔

بحالتِ رکوع صدقہ دیا ہو۔

دوسرا نکتہ

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، یہاں "ولی" کا لفظ مددگار کے معنوں میں نہیں ہے اور دوست کے معنوں میں بھی نہیں ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ "ولی" کا لفظ یہاں بطور مفرد استعمال ہُوا ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ

"خُدا، پیغمبرؐ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں
وہ تمھارے ولی ہیں"۔

تاکہ ہر ایک کو الگ الگ سمجھا جاتے بلکہ فرمایا گیا ہے کہ

"خُدا اور پیغمبر اور ایمان لانے والے سب،
تمھارے لیے "ایک" ولی ہیں۔

اِس سے پتا چلتا ہے کہ یہ ولایت فقط "ایک ولایت" ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ ولایت جہاں تک خدا کا تعلّق ہے اصلی اور حقیقی ہے اور جہاں تک پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں کا تعلق ہے وہ خدا کی متابعت میں ہے اور ذاتِ اقدس کی جانب سے تفویض کی گئی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں کی ولایت خدا کی ولایت کا ہی ایک پہلو ہے اور اس سے جدا یا مستقل کوئی چیز نہیں ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے بھی اس مطلب کی جانب اشارہ کیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"گویا خدا نے ہمیں اپنے ساتھ ملالیا ہے،
کیونکہ اس نے ہماری ولایت کو اپنی ولایت قرار
دیا ہے اور فرمایا ہے: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ
رَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا"۔ [1]

اس کے علاوہ خصوصاً ولایت کے "ایک" ہونے کی بنا پر اس آیت سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ ہر وہ ولایت جو خدا سے منسوب ہے وہ پیغمبرؐ اور "ایمان لانے والوں" سے بھی منسوب ہے۔ اگر وہ ولایت خدا سے منسوب ہوتی اور صرف اسی کی ہوتی تو وہ اس ولایت سے الگ ہوتی جو پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں سے منسوب ہے۔ پس ضروری تھا کہ غلط فہمی دُور کرنے کے لیے لفظ "ولی" کی تکرار کی جاتی اور قرآن مجید میں کئی مواقع پر غلط فہمی دُور کرنے کے لیے الفاظ کی تکرار کی گئی ہے۔

مثلاً ارشاد ہوا ہے:

قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ
یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔

(اے رسولؐ) کہہ دیجیے کہ "کان" ہونا تمہارے
لیے بہتر ہے۔ وہ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور مومنین
کی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۶۱)

یہاں لفظ یُؤْمِنُ کی تکرار ہوئی ہے اور ایسی ہی اور کئی

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۴۶۔ نیا ایڈیشن

مثالیں ہیں۔ چونکہ زیرِ بحث آیت میں لفظ "ولی" کی تکرار نہیں ہوئی، اس لیے پتا چلتا ہے کہ اس کے جو معنیٰ اسے خدا سے منسوب کرنے میں ہیں وہی معنیٰ پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں سے منسوب کرنے میں ہیں، دونوں صورتوں میں مراد "ایک" ہے اور اس میں کوئی تفاوت نہیں۔

قرآن مجید میں خدا کی دو قسم کی ولایت بیان کی گئی ہے:

(۱) تکوین میں ولایت، جس کے مطابق وہ ہستی اور وجود کی دنیا کے نظام میں تصرّف کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ.

"خدا جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

(سورۂ بقرہ۔آیت ۲۵۳)

اور حضرت یوسف علیہ السلام کی مناجات کے سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ.

اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا ولی ہے۔ تو مجھے دنیا سے

مسلمان اُٹھالے اور مجھے نیکوکاروں میں شامل فرما۔

(سورۂ یوسفؑ - آیت ۱۰۱)

اِس آیت سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ "ولی" سے مراد "تکوین" اور خلقت میں ولی ہے۔

پھر فرماتا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۤءَ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

کیا تم خدا کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بناتے ہو؟ ولی تو بس خدا ہی ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(سورۂ شوریٰ - آیت ۹)

یعنی کیا تم خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو ولی اور خالق سمجھتے ہو؟ حالانکہ نظامِ تکوین خدا کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "ولی" سے مراد "ولیِ تکوین" ہے۔

۲ خدا کی دوسری ولایت کا تعلق قانون سازی سے اور ان چیزوں سے ہے جو انسانی معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ.

خدا ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے ہیں،
وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۶)

اور پھر فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ.

خدا مومنوں کا ولی ہے۔

(سورۂ آلِ عمران - آیت ۶۸)

قرآن مجید میں ولایت کی یہ دو اقسام خدا کے لیے ثابت ہیں اور اگر ان میں سے ایک قسم کی ولایت پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں کے لیے محال ہوتی اور ان کے لیے مناسب نہ ہوتی تو زیرِ بحث آیت میں یقیناً لفظ ولی کی تکرار ہوتی۔ چونکہ اس لفظ کی تکرار نہیں کی گئی اس لیے پتا چلتا ہے کہ ولایت کی ان دو اقسام میں سے کوئی بھی نہ صرف یہ کہ ان کے لیے محال نہیں بلکہ یہ امر ثابت ہے کہ وہ بھی ولایت کی ان دونوں اقسام کے حامل ہیں۔[1]

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۶ صفحات ۱۰ - ۱۲

آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ہوسکتا ہے ان کا سمجھنا بعض لوگوں کے لیے مشکل ہو۔ لہذا ان کے متعلق مزید توضیح کی ضرورت ہے۔

امام سے باطنی ہدایت ملنا

ماخوذ از "اصولِ دین" شمارہ ۳ مطبوعہ مؤسسہ در راہ حق قم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام سے باطنی ہدایت

رسولِ اکرمؐ کی زندگی اور آپ کا طرزِ عمل اسلام کے بنیادی لائحۂ کار کا صحیح نمونہ ہے۔ آپ اسلامی معاشرے کے سیاسی رہنما اور فرمانروا بھی تھے اور آپ کو خدا کی جانب سے وحی کے ذریعے اسلامی احکام اور قوانین بھی موصول ہوتے تھے جنھیں آپ اسلامی دائرۂ حکومت میں نافذ فرماتے تھے۔ آپ کا کردار مجسم قانون، آپ کے طور طریقے سراسر اخلاق اور آپ کے ارشاد عاقلانہ اور ٹھوس رہنمائی اور ہدایت کے حامل تھے۔ آپ وعظ و نصیحت پر ہی اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ کا مطمحِ نظر صحیح عدالت پر مبنی ایک مثالی معاشرے کی تشکیل تھا۔

چونکہ اسلام کو معاشرے کی بہبود کے حصول کے سلسلے میں دنیاوی لحاظ سے بھی جزا و سزا کا اختیار حاصل ہے۔ لہذا ایسا نہیں

ہے کہ جو لوگ اپنے جرائم کے ذریعے معاشرے کے مفادات کو نقصان پہنچائیں، یہ دین ان کی سزا کا معاملہ فقط آخرت پر چھوڑ دے، بلکہ یہ اس دنیا میں ہی انھیں مقرر کردہ سزا دیتا ہے۔ پس آنحضرتؐ کا کارِ منصبی لوگوں پر حکومت کرنا اور ان کی رہنمائی کرنا تھا۔

تاہم اسلام بلاشبہ دنیا کے دوسرے حکومتی نظاموں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ وجود انسان کے دوسرے پہلو پر بھی مسلسل نظر رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اکثر معاشرتی احکامات کے ساتھ ساتھ روحانی اور انسانی فضائل حاصل کرنے کی تاکید بھی کرتا ہے۔

اس زمانے میں جس چیز کو انسانی تمدّن میں بہت حد تک بُھلا دیا گیا ہے اور دن بدن اس کے ناپاک نتائج دیکھنے میں آرہے ہیں، وہ یہی مسئلہ یعنی انسانیت اور روحانیت کو فراموش کردینا ہے۔ تاہم اسلام اس اہم معاملے کی جانب خاص توجّہ دیتا ہے اور اس کے پیشواؤں نے اپنے نظریات کی بنیاد ہمیشہ انسانوں کی روحانی تربیت پر رکھی ہے۔

بیشتر لوگ اپنے عظیم الشان انسانی جوہر کی حقیقت سے غافل ہیں کیونکہ یہ اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ فقط روشن دل اشخاص ہی اس کا ادراک کرسکتے ہیں۔ پس عام افراد کے نقطۂ نظر کے مطابق انسان کے وجود کی یہ خوشگوار سرزمین لوگوں کے خیالات مقاصد اور نگاہ سے دور ہے چہ جائیکہ وہ اس میدان میں رہنما بن سکیں وہ اس کی جانب توجّہ دینے سے بھی عاجز ہیں۔ جو انسان صدیاں گزر جانے کے باوجود ابھی تک اپنے بدن کے آدھے طبیعی

افعال اور ان کے ردِ عمل سے واقف نہیں ہو سکا، اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کے مابعد الطبیعیاتی پہلو کو سمجھ لے اور اس دور افتادہ مقام تک پہنچنے کے لیے کوئی منصوبہ پیش کرے؟

لہٰذا اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس میدان میں رہنما وہی شخص ہو سکتا ہے، جس کے وجود کا جوہر مابعد الطبیعیاتی دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ اُس دنیا کا جاننے والا اور اس وادی کے تمام مخفی اور طویل راستوں پر چلنے والا ہو۔ کیونکہ کہا گیا ہے کہ جب تک تم خود راستے پر نہ چلو گے، دوسروں کی رہنمائی کیسے کر سکتے ہو۔

سچ کہیے کہ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم انسان کے روحانی پہلو سے ناامید ہو جائیں۔ ہر انسان کی مخصوص روحانی استعداد اور اس کے ارفع جوہر کو نظر انداز کر دیں۔ پھر اسے حیوانوں کے برابر سمجھیں اور کھانے پینے، سونے، خشمگیں ہونے اور شہوت پرستی کے لیے چھوڑ دیں تا کہ وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح اپنی حیوانی ضروریات کی تکمیل میں ہی اُلجھا رہے۔ نہیں! یہ باتیں ہرگز انسان کے بلند مقام کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

اپنی روحانی اور ملکوتی ضرورتوں اور اس مخصوص استعداد کی بنا پر جو خدا نے اس کی فطرت میں ودیعت کی ہے، انسان تخلیق کا شاہکار اور کائنات کا سورج ہے۔ اسے چاہیے کہ چمکتے ہوئے سورج کی طرح ان بلندیوں پر پہنچے جو دسترس سے دُور ہوں اور سورج کی طرح تمام آفاق کو روشنی اور حرارت پہنچائے۔ کیونکہ یہ

برگزیدہ مخلوق کائنات میں سرگرداں رہنے کے لیے نہیں ہے۔ گو یہ ایک ذرّہ ہے لیکن الوہیت کے بلند سورج کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور خدا نے اپنی تمام مخلوق میں سے اس پر زیادہ مہربانی کی نگاہ ڈالی ہے۔

انسان پر خدا کی اس مہربانی کے آثار ہمیں اس کی تاریخ کے دوران میں پیغمبروں کی بعثت کی بدولت نظر آتے ہیں۔ اسی عنایت اور مہربانی کی بنا پر خدا نے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں اور ان کی بلند رُوح کو بے آرامی اور آشفتگی سے نجات دلائیں اور عظیم رتبے پر پہنچائیں۔

قرآن مجید نے بے شمار آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً وہ آیت جس میں حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ.

اے پروردگار! میری اولاد کے لیے انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیج جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے اور پاکیزہ کر دے۔ بے شک تو ہی غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۲۹)

اِسی آیت سے اس بات کا واضح طور سے پتا چلتا ہے کہ دانش،

حکمت اور رہنمائی کے علاوہ پاکیزگی اور تزکیۂ نفس کو (جو دوسرے لفظوں میں روحانی تربیت ہے) انبیائے کرامؑ کی دعوت کے ارکان میں شمار کیا گیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ کے مکتب میں لوگوں نے یہ خاص تربیت حاصل کی اور حیرت انگیز اور خیرہ کن انداز میں ترقی کی۔ سلمان، ابوذر، مقداد، عمار، ہیثم اور اویس قرنی رضوان اللہ علیہم کا تعلق اسی بلند مرتبہ گروہ سے تھا۔ ان کا وجود نیکی اور پاکیزگی کا سرچشمہ تھا کہ وہ تمام برائیوں سے پاک ہو گئے تھے، وہ خدا کے علاوہ نہ کسی کی خواہش رکھتے تھے اور نہ ہی کسی کو دیکھتے تھے۔ ان کے پورے وجود اور ان کی جان، دل، روح اور بدن پر فقط خدا کی حکومت تھی یہی وجہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک کمال یافتہ انسان کا نمونہ تھا اور انھوں نے اپنے وقت کے انسانوں اور معاشرے کی سرفرازی کے لیے عظیم خدمات انجام دیں۔

پس اخلاق اور روح کی اصلاح محض رسمی اور اضافی موضوع نہیں ہے کہ ہم اس سے لاتعلق رہیں، حتیٰ کہ زندگی کے تمام مسائل سے فارغ ہو جائیں اور ہمارا شوق اور زندگی اس بات کا موقع اور فرصت دیں تو اس موضوع کی جانب بھی توجّہ دیں۔ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ اخلاق زندگی کی تعمیر کرتا ہے اور اس کا ایک حصّہ ہے اور بلاشبہ بہت زیادہ اہم ہے یعنی عقل اور ہوش اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بلند پایہ اخلاقی صفات اور روح کی پاکیزگی اس قدر عظیم اور عمیق چیزیں ہیں کہ انسان ان کی پناہ میں صورت اور نقش

سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر وہ رُوحانی زندگی اور اپنی گرانبہا انسانی حقیقت تک جا پہنچتا ہے حتیٰ کہ

"وہ کچھ دیکھتا ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا"[1]

رُوحانی زندگی کی جانب قرآنی اشارے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔

مرد ہو یا عورت، جو شخص نیک کام کرے اور ایمان دار بھی ہو ہم اسے پاک اور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔ (سورۂ نحل - آیت ۹۷)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۔

جب خدا اور پیغمبر تمھیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمھاری روحانی زندگی کا باعث ہو تو تم ان کا حکم مانو کیونکہ تم زندہ کیے جاؤ گے۔

(سورۂ انفال - آیت ۲۴)

ظاہر ہے کہ جس زندگی کا مندرجہ بالا آیات میں ذکر کیا گیا ہے، وہ ظاہری طور پر زندہ ہونے سے مختلف ہے۔ وہ روحانی زندگی اور انسان کے صحیح طور پر زندہ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں اور

---

[1] یہ معمولی تغیر کے ساتھ ہاتف اصفہانی کے ایک مصرعے کا ترجمہ ہے۔

ایسی زندگی نیک کردار اور تزکیۂ نفس کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔[1]

رُوحانی زندگی کس طرح وجود میں آتی ہے؟

دُوسرے مظاہر کی طرح روحانی زندگی کی پیدائش کے لیے بھی کچھ لازمی شرائط ہیں۔

روحانی زندگی انسان کے طرزِ عمل اور کردار کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ یہ وہ طرزِ عمل اور کردار ہے جو صحیح تعلیم سے جنم لیتا ہے اور آسمانی رہبروں سے سیکھا جاتا ہے۔

خداوند تعالیٰ کے اوامر و نواہی جنھیں اصطلاحاً "تشریع" کہا جاتا ہے، وہ کائنات اور عالم ہستی یعنی "تکوین" سے مکمل ربط اور وابستگی رکھتے ہیں۔ چونکہ ہماری عقل بہت ہی محدود ہے اور ہم کائنات کے حقائق اور اس کے اہم واقعات کی اچھائی اور برائی کو نہیں سمجھ پاتے، لہٰذا ہم اس طرزِ عمل سے بے خبر ہیں جو ہماری روحانی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ لیکن امام ان حقائق اور عظیم الشان

---

[1] ان آیات میں حیاتِ طیبہ کے معنیٰ زندگی کا کوئی مجازی پہلو نہیں ہے بلکہ ان آیتوں کا مضمون بتاتا ہے کہ جس مؤمن کا کردار صالح اور نیک ہو اسے ایسی زندگی عطا ہو جاتی ہے، جس میں وہ ایک عجیب شعور، طاقت اور ادراک کا احساس کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے مومنوں کو دوسروں سے بڑھ کر علم اور قدرت مل جاتی ہے۔

مصلحتوں کو ایک صاحبِ علم اور شفیق استاد کی طرح بنی نوع انسان کے لیے پوری وضاحت سے بیان کرتے ہیں، تاکہ ہم اس خوش بختی سے ہمکنار ہوں اور روحانی زندگی حاصل کریں۔

لہٰذا دین ہمارے عام ادراک سے بالاتر حقائق اور معارف کا مجموعہ ہے، جنھیں خدا نے اپنے پیغمبرؐ اور ان کے پاک اور معصوم جانشینوں کے ذریعے بیان فرمایا ہے۔ تاکہ وہ ہمارے اندر رُوحانی زندگی کو وجود میں لائیں کہ جو ہماری دائمی خوش بختی کی ضمانت بن جائے۔ اب اگر ہم حکم بجالائیں تو نجات پائیں گے ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بچّہ تربیت پاتا ہے اور استاد سے فقط کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں احکام سُنتا ہے اور انھیں بے چون وچرا بجا لاتا ہے۔ اگرچہ وہ ان احکام کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتا اور اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کی بجاآوری میں کیا فائدہ ہے۔ لیکن جب وہ اپنی تربیت کے دن گزار چکے گا تو اس کی بدولت جو اچھّے اخلاق اور پسندیدہ طور طریقے اس کے اندر وجود میں آئیں گے، ان کے ذریعے اس کی زندگی خوشگوار ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ استاد کے احکام سے سرتابی کرے گا تو بعد میں اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کتنا نقصان اٹھایا ہے۔

روحانی زندگی کے حصول اور ترقی کے لیے یقیناً ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ رہنمائی کس کا حصّہ ہے، کیا یہ کام ایک عام آدمی انجام دے سکتا ہے یا رہنما کوئی ایسا شخص ہو جس کے الفاظ یقینی اور پائیدار ہوں، وہ اپنے طرزِ عمل میں غلطیوں

سے محفوظ اور اصطلاحاً "معصوم" ہو اور بذات خود روحانی زندگی کی بلند چوٹی پر کھڑا ہو۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ جب تک کسی شخص کو مکمل طور پر ہدایت سے بہرہ ور نہ کردے، دوسروں کی ہدایت کا کام اس کے سپرد نہیں کرتا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ

جو شخص دین کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے حکم کی پیروی کی جائے یا۔ وہ شخص کہ جب تک اسے کوئی دوسرا راہ نہ بتائے خود راہ نہیں دیکھ سکتا۔ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے اور تم کیسا حکم لگاتے ہو؟ (سورۂ یونس ع۔ آیت ۳۵)

پھر اس کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ بنیادی طور پر امامت کے معنیٰ عام ہدایت کے نہیں ہیں۔ کیونکہ ایسی ہدایت ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور یہ امام سے مخصوص نہیں ہے۔

پس امام کی طرف سے ہدایت سے مراد "امر کی جانب ہدایت" ہے۔ لہٰذا جب تک وہ (یعنی ائمہؑ) روحانی زندگی حاصل نہ کرلیں اور کائنات کے سربستہ راز ان پر منکشف نہ ہوجائیں، وہ اس قسم کی ہدایت کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتے۔

امامت اور ھدایت کے سلسلے میں قرآنی آیات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ جہاں کہیں امامت کا مفہوم بیان کیا گیا ہے وہاں

"اُمر کی جانب ہدایت" کے مسئلے کی تفسیر اور وضاحت بھی کی گئی ہے۔

"اُمر کی جانب ہدایت" کیا ہے؟

ظاہری احکام اور ہدایت سکھانے کے ساتھ ساتھ امام باطنی ولایت اور ہدایت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ یعنی جو لوگ استعداد اور قابلیت رکھتے ہوں امام ان کا ہاتھ باطنی طور پر پکڑتا ہے اور ان کی رہنمائی کمال کی جانب کرتا ہے۔ چونکہ یہ ہدایت "روحانی فیض اور باطنی مقامات" کی بنیاد پر دی جاتی ہے، اس لیے اسے "امر کی جانب ہدایت" کا نام دیا گیا ہے۔

"باطنی ہدایت" وہ بلند مقام ہے، جس پر بڑے بڑے پیغمبر بھی رُتبۂ پیغمبری پر فائز ہونے کے بعد پہنچے ہیں۔ مثلاً خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو پیغمبری عطا کرنے کے بعد امامت اور باطنی ہدایت کے مقام پر پہنچایا اور فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا.

میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۲۴)

امام جب ولایت اور "امر کی جانب ہدایت" کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ ایسے کام کرسکتا ہے جو عام لوگوں کو حیرت انگیز اور ناممکن معلوم ہوتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید نے شہادت دی ہے کہ ملکہ سبا کے حضرت

سلیمانؑ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی ان کا ایک وزیر، آصف بن برخیا آنکھ جھپکتے میں اس کا تخت لے آیا۔ کیونکہ وہ مابعدالطبیعیاتی دنیا پر مسلّط تھا اور اس نے اس دنیا کے کچھ پوشیدہ حقائق کا علم حاصل کرلیا تھا۔

ہمارے معصوم پیشواؤں اور ائمہؑ علیہم السلام کا مرتبہ آصف سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ معتبر تواریخ اور صحیح روایات ـــــ جن میں ہمارے عالی قدر اماموں کی روحانی ہدایت اور باطنی ولایت کے سلسلے میں بہت سی داستانیں بیان کی گئی ہیں ـــــ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں۔

بہرحال امام چونکہ خود رُوحانی زندگی کے بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے، اس لیے وہ ایک ایسی ہدایت اور روحانی جذبے کا حامل ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ شائستہ لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالتا ہے اور انھیں اپنے زیرِ اثر لاکر ان کی رہنمائی کمال کی جانب کرتا ہے۔ اس بارے میں ہمیں اماموں کے شاگردوں کے اس گروہ کے حالاتِ زندگی سے پتا چلتا ہے جن کے گرانبہا وجود پر تاریخ فخر کرتی ہے۔

ذیل میں ان بزرگوں کی چند مثالیں درج ہیں:

۱۔ دمشق کا ایک شخص

علی بن خالد جو نویں امام حضرت جواد علیہ السلام کے زمانے میں زندگی بسر کر رہا تھا، "زیدی" تھا یعنی چوتھے امام، حضرت زین العابدین علیہ السلام کے بعد آنے والے اماموں کو نہیں مانتا تھا۔

اس کا کہنا ہے کہ میں شہر سامرا میں تھا جب کہ میں نے سُنا کہ ایک ایسے شخص کو جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے دمشق سے پکڑ کر لایا گیا ہے اور قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ چنانچہ میں اس سے ملنے چلا گیا۔

میں نے اس سے پُوچھا: تمھارا کیا حال ہے اور تمھارا قصّہ کیا ہے؟

اس نے جواب دیا: میں ایک رات شام میں اس مقام پر عبادت میں مشغول تھا، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں سیّدُ الشہدا حضرت امام حسینؑ کا سرِ مُبارک رکھا گیا تھا، اچانک میں نے دیکھا کہ ایک بزرگوار میرے سامنے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اُٹھ! .... میں غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دور تک ان کے ساتھ چلا، اِتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں مسجدِ کوفہ میں ہوں۔ ان بزرگوار نے دریافت کیا: کیا تم اس مسجد کو پہچانتے ہو؟

میں نے جواب دیا: جی ہاں یہ مسجدِ کوفہ ہے۔ انھوں نے نماز پڑھی اور میں نے بھی ان کے ساتھ ہی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ہم دونوں دوبارہ روانہ ہو گئے۔

ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو مسجدِ نبوی میں پایا۔ ان بزرگوار نے رسولِ اکرمؐ پر درود بھیجا اور ہم دونوں نے وہاں نماز بھی پڑھی۔

پھر ہم وہاں سے نکلے اور راستہ چلنے لگے، ایک لحظہ کے بعد میں نے دیکھا کہ میں مکہ مکرمہ میں ہوں۔ وہاں ہم دونوں خانۂ خُدا

کا طواف کر کے باہر نکلے اور زیادہ دور تک نہیں چلے تھے کہ میں نے دیکھا، میں دمشق میں اپنے پہلے مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ وہ بزرگوار اب میری نظروں سے غائب ہوگئے، یوں سمجھیے کہ ایک معطّر ہوا کا جھونکا تھا جو چہرے کو چھُو کر گزر گیا۔

اِس واقعہ کو ایک سال گزر گیا، سال بھر کے بعد میری ملاقات دوبارہ ان بزرگوار سے ہوگئی اور میں انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ انھوں نے ایک بار پھر مجھے مقدس مقامات کے سفر کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم نے مل کر دوبارہ ان پُرنور مقامات کی زیارت کی۔ تاہم جب وہ بزرگوار مجھ سے جدا ہونے لگے تو میں نے اُن سے کہا:

میں آپ کو اس ہستی کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو اتنی قوت بخشی ہے کہ آپ اپنا تعارف مجھ سے کرادیں۔

انھوں نے فرمایا:

"میں محمدؑ بن علیؑ بن موسیٰؑ بن جعفرؑ ہوں۔"

پھر جن جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی، میں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا، حتّٰی کہ یہ خبر محمد بن عبدالملک زیات تک پہنچی۔ اس نے میری گرفتاری کا حکم دیا اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اب جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں میں اس قید خانے میں ہوں۔

میں نے اس سے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھارے حالات محمد بن عبدالملک کو لکھ بھیجوں؟

اس نے جواب دیا: "لکھ بھیجیے۔"
میں نے محمد بن عبدالملک کو خط لکھا تو اس نے جواب میں یہ لکھ بھیجا:

"اس سے کہہ دو کہ جو شخص اسے ایک رات میں شام سے کوفہ اور پھر مدینہ اور مکہ اور پھر دوبارہ دمشق لے گیا، اسے ہی کہے کہ وہ اسے اس قید خانے سے رہائی دلائے۔"

مجھے یہ جواب پڑھ کر دکھ ہوا اور دوسرے دن میں صبح کے وقت قید خانے گیا تاکہ اسے خط کے جواب کے بارے میں بتا دوں تاہم میں نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی اور بے شمار لوگ قید خانے کے علاقے میں گھوم رہے ہیں۔

میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا ماجرا ہے؟
انھوں نے بتایا کہ جس قیدی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، وہ قید خانے سے بھاگ نکلا ہے اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ آیا وہ اُڑ کر آسمان پر جا پہنچا یا اسے زمین نگل گئی۔

علی بن خالد کہتا ہے: اس واقعہ کے پیشِ نظر میں نے اپنا "زیدی" عقیدہ ترک کر دیا اور نویں امام حضرت جوادؑ کے شیعوں میں شامل ہو گیا۔[1]

---

[1] شیخ مفید۔ الارشاد صفحہ ۳۰۴ - ۳۰۵ نیز بحار الانوار جلد ۵۰ صفحہ ۳۸ میں یہ واقعہ اصول کافی جیسی معتبر کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ میثم تمارؓ

امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام نے میثم کو خریدا اور آزاد کر دیا۔ دریں اثنا آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تمھارا نام کیا ہے؟

اس نے جواب دیا: سالم۔

امام علیؑ نے فرمایا: لیکن میں نے تو رسولِ اکرمؐ سے سنا ہے کہ تمھارا اصلی نام میثم ہے؟

میثم نے جواب دیا: آنحضرتؐ نے بجا فرمایا ہے اور آپ بھی درست فرماتے ہیں: میرا اصلی نام میثم ہی ہے۔

امام علیؑ نے فرمایا: پس تم وہی نام اختیار کرو جس کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے اور دوسرا نام ترک کر دو۔

یوں امام علیؑ نے ایک غلام خریدا اور اسے آزاد کر دیا لیکن اس کی گردن میں مہربانی کی ایسی ڈوری ڈالی جس میں وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک بندھا رہا حتیٰ کہ موت بھی اس ڈوری کو اس کی گردن سے الگ نہ کر سکی۔

جناب میثم ایک شریف النفس انسان اور حیرت انگیز استعداد کے مالک تھے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ امام علیؑ کے مکتب میں بے پناہ عزّت حاصل کر لی اور ان کا شمار آپ کے خاص دوستوں میں ہونے لگا۔

انھیں دقیق مسائل اور حقیقتوں کا علم ہو گیا۔ انھیں امام سے

ایسا ہی عشق تھا جیسا کہ کملائے ہوئے پودوں کو بارش سے ہوتا ہے۔ وہ انھیں سے فیضان حاصل کرتے، انھیں کی خدمت میں رہتے اور انھیں کی بدولت اپنے دل کی روشنی اور روح کی خوشی میں اضافہ کرتے تھے۔ ہاں یہ ایسی لذّت تھی جس سے وہ دنیا جہان کی دولت کے عوض بھی دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔

ایک دن امام علیؑ نے ان سے فرمایا :

"ہمارے بعد تمھیں سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور تیسرے دن تمھاری ناک اور مُنہ کے خون سے تمھاری ڈارھی رنگین ہوجائے گی، تمھیں عمرو بن حُریث کے گھر کے پاس دوسرے نو افراد کے ساتھ سُولی پر لٹکا دیا جائے گا، تم سب شہید ہوجاؤ گے اور تمھاری سُولی کا تختہ سب سے چھوٹا ہوگا۔ چلو چلیں تاکہ ہم تمھیں کھجور کا وہ درخت دکھائیں جو بالآخر تمھاری سولی کا تختہ بنے گا۔"

امام علیہ السلام نے اس دن وہ درخت میثم کو دکھایا۔ پھر کئی سال گزر گئے، امام علیؑ شہید ہوگئے اور بنی امیہ نے لوگوں پر غلبہ پالیا۔

جناب میثم اکثر اس درخت کے پاس جاکر نماز پڑھتے اور اس سے یوں ہمکلام ہوتے :

"اے درخت! خدا تجھے برکت دے، میں تیرے لیے پیدا کیا گیا ہوں اور تو میرے لیے پھل پھول

رہا ہے۔

جناب میثم اپنی شہادت کے سال میں خانۂ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضرت ام سلمہؓ سے بھی ملاقات کی حضرت ام سلمہ نے انھیں کہا : میں اکثر رسولِ اکرمؐ کو آپ کا نام لیتے سنتی تھی اور وہ علیؑ سے آپ کی سفارش کیا کرتے تھے۔

جناب میثم نے ان سے امام حسینؑ کے بارے میں دریافت کیا اور جب انھوں نے بتایا کہ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں تو ان سے کہا : انھیں میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور کہیے گا کہ "اب زیادہ وقت نہیں لگے گا جب میں اور آپ دوسری دُنیا میں اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں ایک دُوسرے سے ملاقات کریں گے۔"

حضرت ام سلمہؓ نے عطر منگوا بھیجا تاکہ جناب میثم اپنی ڈاڑھی کو خوشبو لگائیں۔ پھر انھیں کہا :

"وہ وقت جلد آنے والا ہے جب (رسولِ اکرمؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ کی محبّت میں) آپ کی ڈاڑھی خون سے رنگین ہوجائے گی۔"

جناب میثم کوفہ پہنچے تو ابن زیاد کے اہلِ کاروں نے انھیں گرفتار کرلیا اور اس کے پاس لے گئے۔ پھر ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی :

ابن زیاد : تمھارا خدا کہاں ہے ؟

جناب میثم : ظالموں کی گھات میں ہے اور تم ان میں سے ایک ہو!

ابنِ زیاد : تمھارے مولا نے میرے اور تمھارے متعلق کیا کہا ہے؟

جنابِ میثم : انھوں نے فرمایا ہے کہ تم مجھے دوسرے نو افراد کے پہلو بہ پہلو سولی پر چڑھا دوگے اور میری سولی کا تختہ سب سے چھوٹا ہوگا۔

ابنِ زیاد : میں چاہتا ہوں کہ تمھارے مولا نے جو کچھ کہا ہے اس کے خلاف کروں اور تمھیں کسی اور طریقے سے قتل کروں۔

جنابِ میثم: تم یہ کیسے کر سکتے ہو؟ انھوں نے یہ اطلاع رسولِ اکرمؐ کی طرف سے اور آنحضرتؐ نے خدا کی طرف سے دی ہے۔ کیا تم خدا کی مخالفت کر سکتے ہو؟ میں اپنی شہادت کی جگہ سے بھی واقف ہوں اور میں ہی وہ پہلا مسلمان ہوں جس کے مُنہ میں لگام دی جائے گی

عبید اللہ بن زیاد کو بے حد طیش آیا اور اس نے حکم دیا کہ انھیں قید خانے میں رکھا جائے۔

اسی قید خانے میں جناب میثم کی ملاقات مختار ثقفی سے ہوئی۔ انھوں نے اسے آزادی کی خوشخبری دی اور کہا کہ تم حضرت سیّد الشہداء علیہ السلام کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر ابن زیاد کو موت کے گھاٹ اتار دوگے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

بالآخر انھیں قربان گاہ میں لے جایا گیا اور اسی درخت کی لکڑی پر سولی پر لٹکا دیا گیا جسے وہ پہلے سے پہچانتے تھے، تب لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔

سولی پر لٹکے ہوئے انھیں امام علی علیہ السلام کے فضائل

بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انھوں نے زبان کھولی، لوگوں کو حقائق سے آگاہ کیا اور ان کے دل مسخر کر لیے۔ حکومت کے کارندوں نے ابنِ زیاد کو اطلاع دی کہ جناب میثم تمھیں ذلیل کر رہے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے منہ میں لگام ڈال دی جائے تاکہ وہ بول نہ سکیں۔

اور تیسرے دن، جیسا کہ امام علیؑ نے خبر دی تھی، ان پر ایک حربہ پھینکا گیا، جس پر انھوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ اسی دن کے آخری حصّے میں ان کے مُنہ اور ناک سے خون جاری ہوگیا اور ان کی ڈاڑھی خون سے رنگین ہوگئی۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔[1]

اویس قرنیؓ

رسول اکرمؐ نے فرمایا: ہمیں یمن کی طرف سے بہشت کی خوشبو آتی ہے۔ اے اویسِ قرنی! میں تمھارا بہت مشتاق ہوں پس جو شخص بھی اس سے ملے، وہ ہمارا سلام اس کو پہنچا دے۔[2]

جب "ذی قار" کے علاقے کے لوگ امام علی علیہ السلام کی بیعت کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: کوفہ کی جانب سے نہ کم نہ زیادہ بلکہ پورے ایک ہزار جنگجو سپاہی آئیں گے اور ہمارے

---

[1] شیخ مفید۔ الارشاد صفحہ ۱۵۲-۱۵۳۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۵۳۔

ہاتھ پر بیعت کریں گے۔"

جب وہ اشخاص آگئے تو ابن عبّاس نے انھیں گنا اور پتا چلا کہ وہ ۹۹۹ ہیں۔ انھیں حیرت ہوئی کہ ایک شخص کم کیوں ہے؟

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور شخص آپہنچا۔ اس نے اونی لباس پہن رکھا تھا اور تلوار، سپر اور دوسرے جنگی لوازمات سے لیس تھا۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں اپنی زندگی کے آخری لمحات اور جان قربان کرنے کی حد تک آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: تمھارا نام کیا ہے؟

اس نے جواب دیا: اُویس۔

آپ نے پوچھا: کیا تم اُویس قرنی ہو؟

جناب اویس نے جواب دیا: جی ہاں۔

اِس پر امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ اکبر! میرے محبوب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے خبر دی تھی کہ میری ملاقات ان کے ایک ایسے پیرو سے ہوگی جس کا نام اویس قرنی ہوگا۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے گروہ سے ہے، اسے شہادت نصیب ہوگی اور وہ بے شمار لوگوں کی شفاعت کرے گا۔

(شیخ مفید۔ الارشاد صفحہ ۱۴۹)

حرف بہ حرف یہی کچھ ہوا۔ جناب اویس قرنیؓ امام علی علیہ السلام کے ہمرکاب شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

(اسد الغابہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۲)

روحانی لحاظ سے جناب اویسؓ ایک بڑا بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھیں عبادت میں بے حد لذت ملتی تھی اور ان کو مالِ دُنیا سے کوئی رغبت نہ تھی۔ چنانچہ وہ آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش وہ ازل سے ابد تک اللہ تعالیٰ کو سجدے کرتے رہتے۔

(اعیان الشیعہ جلد ۱۳ صفحہ ۸۳ تا ۹۳ دوسرا ایڈیشن)

جناب اویسؓ اپنی والدہ کے اخراجات کے کفیل تھے ایک دن انھوں نے اپنی والدہ سے اجازت مانگی کہ وہ یمن سے مدینہ جاکر رسول اکرمؐ کی زیارت کر آئیں۔ ان کی والدہ نے یہ اجازت اس شرط پر دی کہ یہ زیارت آدھے دن سے زیادہ طول نہیں کھینچے گی۔

جب اویسؓ مدینہ پہنچے تو اتفاق سے رسولِ اکرمؐ مدینہ میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ جناب اویسؓ نے اپنی والدہ سے وعدہ کر رکھا تھا، اس لیے ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں رُکے اور گھر لوٹ گئے۔

جب آنحضرتؐ واپس تشریف لائے تو دریافت فرمایا: یہ کیسا نور ہے جو ہم گھر میں دیکھ رہے ہیں؟

جواب میں آپ کو بتایا گیا کہ اویس قرنیؓ ایک شتربان وہاں آیا تھا اور پھر واپس چلا گیا۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: ..... اور یہ نور ہمارے گھر میں تحفے کے طور پر چھوڑ گیا۔

(بحار الانوار جلد ۴۲ صفحہ ۱۵۵)

اویس قرنیؓ نے جو کچھ کہا اس سے ان کے عظیم روحانی مراتب کا پتا چلتا ہے:

خُدا کی قسم! موت کے بارے میں سوچنا اور روزِ قیامت کا خوف ایک باایمان شخص کے لیے دنیا میں خوشی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔

اگر تمام مسلمان حق کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں تو پھر کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کے باعث ہمیں بُرا بھلا کہے اور تہمت لگائے۔ تاہم اس کے باوجود ہم خدا کی خاطر قیام کرتے ہیں۔ (سفینۃ البحار جلد۱ صفحہ ۵۳)

قنبرؓ

جناب قنبر بھی ان حریت پسند اشخاص میں سے تھے، جو رسولِ اکرمؐ اور حضرت علی علیہ السلام کی روحانی قوت سے اکتسابِ فیض کر کے بے حد بلند مقام پر پہنچے۔ انھیں سچّی بات کہنے اور سیدھے راستے پر چلنے میں کوئی باک نہ تھا۔ اگرچہ دنیا پرستوں کی نظر میں بظاہر ان کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہ تھی، لیکن انھوں نے روحانی لحاظ سے اتنا بلند مرتبہ پایا کہ امام علیؑ کے اسرار کے محرم بن گئے۔

ان قوی الارادہ بزرگوار کے وہ زندہ اور پرجوش جملے بے حد مشہور ہیں جو انھوں نے ظالم جلّاد حجاج بن یوسف کے سامنے ادا کیے، جسے جرائم اور خونریزی کر کے خوش ہونے کا مرض لاحق تھا۔

حجّاج نے پوچھا: تم علیؑ کی خدمت میں کیا کرتے تھے؟

جناب قنبر نے جواب دیا : میں ان کو وضو کے لیے پانی پیش کرتا تھا۔

حجاج نے پوچھا : جب وہ وضو کر چکتے تھے تو کیا کہتے تھے؟

جناب قنبر نے جواب میں کہا : وہ یہ آیت پڑھتے تھے :

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

"جب انھوں نے ہماری یاد دلوں سے بھلا دی تو ہم نے سبھی دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ حتیٰ کہ وہ جو کچھ ہم نے دیا اس سے خوش ہو گئے (پھر) اچانک وہ سب کچھ ان سے واپس لے لیتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ ظالموں کی جڑ کٹ جائے۔ والحمد للہ رب العالمین۔" (سورۂ انعام - آیت ۴۴، ۴۵)

حجاج نے کہا : میرا خیال ہے کہ وہ اس آیت کا اطلاق ہم لوگوں پر کرتے تھے؟

جناب قنبر نے کمال دلیری سے جواب دیا : ہاں۔

حجاج نے کہا : اگر میں تمھیں قتل کر دوں تو تم کیا کرو گے؟

جناب قنبر نے جواب دیا : مجھے سعادت نصیب ہو گی اور تو بدبخت ٹھہرے گا۔ (بحار الانوار جلد ۴۲ صفحہ ۱۳۵)

حجاج نے کہا : اپنے مولا (علیؑ) سے بیزاری کا اظہار کرو۔

جناب قنبر نے کہا : اگر میں ان کا دین ترک کردوں تو کیا تم میری رہنمائی اس سے بہتر دین کی جانب کرو گے؟

حجاج نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور کہا: میں تمھیں قتل کرنے والا ہوں۔ تم بتاؤ کہ تمھیں کس طرح قتل ہونا پسند ہے تاکہ میں تمھیں اسی طرح قتل کروں؟

جناب قنبر نے جواب دیا: اس بات کا فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔

حجاج نے پوچھا: کیوں؟

جناب قنبر نے جواب میں کہا: کیونکہ جس طرح تم مجھے قتل کرو گے اسی طرح تمھیں بھی ناحق قتل کیا جائے گا۔ میرے مولا نے مجھے خبر دی ہے کہ مجھے ظالمانہ طور پر اور ناحق قتل کیا جائے گا۔

حجاج نے حکم دیا کہ "ان کی گردن اڑا دی جائے"۔

(شیخ مفید۔ الارشاد صفحہ ۱۵۵)

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔

"جن لوگوں نے کہا کہ "اللہ" ہمارا پروردگار ہے اور پھر اس پر مضبوطی سے قائم رہے، ان پر رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ کچھ خوف نہ کرو اور غم نہ کھاؤ، جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی خوشیاں مناؤ"۔

(سورہ حٰم سجدہ۔ آیت ۳۰)

CULTURAL CENTRE OF THE ISLAMIC REPUBLIC OF IRAN

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت
اسلام دینِ معاشرت
اسلام دینِ معرفت
اسلام دینِ حکمت
فلسفۂ معجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ حجاب
فلسفۂ احکام
تاریخِ عاشوراء
گفتارِ عاشوراء
بنائے کربلا
مرگِ گُل رنگ
مکتبِ اسلام
مکتبِ رسولؐ
مکتبِ تشیّع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
توضیح المسائل اردو
توضیح المسائل فارسی
شریعت کے احکام

کتابُ الدعاء والزیارات
اعمالِ حج
حکایاتُ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَة
سخن
ابُوطالب۔ مظلومِ تاریخ
تفسیر سورۂ حمد
شرحِ قرآن
سَیر و سُلوک
یَسَّرْنَا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
حدیثِ کساء
دُعائے کمیلؒ

نیز بچّوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان